تدبّر

زیرِ نگرانی

مولانا امین احسن اصلاحی

تدبر

سلسلہ نمبر ۱۷ شعبان ۱۴۰۶ھ اپریل ۱۹۸۶ء

فہرستِ مضامین

تذکرہ و تبصرہ
فقہ القرآن ——— عبداللہ غلام احمد ۳

تدبرِ قرآن
تفسیر سورۂ آلِ عمران (۶) ——— خالد مسعود ۶

اصولِ تدبرِ حدیث
تحقیقِ حدیث میں صحابہ کرامؓ کا طرزِ عمل ——— خالد مسعود ۱۱

حکمتِ قرآن
آخرت اور جزا و سزا
فلسفہ اور قرآن کی روشنی میں (۲) ——— امین احسن اصلاحی / محبوب سبحانی ۲۰

تزکیۂ نفس
آدمی کا تعلق معاشرہ سے ——— امین احسن اصلاحی ۳۲

مجلسِ ترتیب:

- ـــــ خالد مسعود (مدیر)
- ـــــ عبداللہ غلام احمد
- ـــــ ماجد خاور
- ـــــ محبوب سبحانی

ناشر : ـــــ ادارہ تدبر قرآن وحدیث
رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، سمن آباد، لاہور۔ ۲۵
مطبع : ـــــ المطبعة العربية۔ لاہور
قیمت : ۴/۔ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ وتبصرہ

عبداللہ غلام احمد

فقہ القرآن

جب سے پاکستان وجود میں آیا ہے لوگوں کی خواہش رہی ہے کہ اس ملک میں اسلامی شریعت کا نفاذ ہو مگر ایک طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود اس سمت میں کوئی خاص پیش رفت ہوتی نظر نہیں آئی۔ جو لوگ اسلامی نظام کے قیام کے مخالف ہیں وہ اس کے خلاف سب سے بڑی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ اسلام کے اندر مختلف فقہی گروہ پیدا ہو چکے ہیں اور اب یہ ممکن نہیں رہا کہ ان گروہوں کو کسی ایک مسلک کے تحت جمع کیا جا سکے۔ یہ خیال اگرچہ ایک نہایت محدود گروہ کا خیال ہے اور یہ امکان نہیں کہ یہ گروہ ملک کی رائے عامہ پر غالب آ سکے مگر اس حقیقت سے بھی صرفِ نظر ممکن نہیں کہ مسلمانوں کے درمیان سرسری اور سطحی قسم کے جو اختلافات تھے وہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ اس قدر پختہ اور گہرے ہو چکے ہیں کہ ان کا استیصال آسان نہیں رہا اور ان کو ختم کیے بغیر نہ اسلامی قانون کی تدوین ممکن ہے اور نہ اس کے مؤثر نفاذ کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اسلامی قانون کے صحیح اور مؤثر نفاذ کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ تمام مسلمان من حیث الجماعت تمام گروہی تعصبات سے بالاتر ہو کر تسلیم کریں کہ ان کے قانون کو پرکھنے کے لیے محض کسوٹی قرآن وسنت ہیں۔

مسلمانوں کے اندر تشتت وتفرق کی ایک وجہ فقہائے متاخرین کا تقلید وجمود ہے۔ ایک ہی متعین امام کی تقلید اور تنہا اسی کے اقوال کی پیروی نے الگ الگ اماموں کے مقلدین اور متبعین کے الگ الگ گروہ بنا دیے ہیں اور ان میں سے ہر ایک حق وہدایت کو اپنے ہی امام اور اس کے متبعین کے اندر محصور ماننے لگا ہے۔ اسلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو بھی یہ درجہ نہیں دیا کہ اس کی ہر بات تنقید کے بغیر تسلیم کر لی جائے۔ اجتہاد خواہ کتنے ہی بڑے آدمی کا ہو اس میں غلطی اور صحت دونوں کا احتمال ہو سکتا ہے اس لیے اجتہادی امور میں رواداری اور وسعتِ قلب کا دامن چھوڑ کر تعصب اور تشدد کی راہ اختیار کرنا اور کسی ایک اجتہاد کو نص کا درجہ دے کر دوسروں سے لڑنا جھگڑنا درست نہیں۔ ہمارے ائمہ کرام جن کی تقلید پر زور آجکل بڑے شد ومد سے دیا جاتا ہے، ان میں

سے ہر ایک نے خود تقلید پر کاری ضرب لگائی ہے۔

مختلف فقہی گروہوں کی موجودگی میں، اگرچہ کوئی گروہ اکثریت میں بھی ہو، اسلامی ریاست کسی ایک امام کی تقلید یا کسی ایک فقہ کی پیروی کے اصول پر قائم نہیں کی جا سکتی بلکہ لازم ہے کہ اس کی بنیاد براہ راست کتاب و سنت اور اجتہاد و شوریٰ پر ہو، ہمارے علمائے کرام اجتہادی امور میں مختلف آئمہ کرام کے اجتہادات پر ترجیح اور تعصب کے بغیر نگاہ ڈال کر ان اقوال اور آراء کو اختیار کریں جو ان کی نظر میں کتاب و سنت اور روح اسلام کے قریب تر نظر آئیں اور جن امور سے متعلق پچھلے آئمہ کے اجتہادات میں کوئی قول یا رائے نہ ملے، کتاب و سنت کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر خود اس کا حل تلاش کرنے کی کوشش کریں۔

اس وقت جب کہ ملک میں نفاذِ شریعت کے لیے اقدامات کی امید پیدا ہوئی ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ علمائے کرام فقہی اختلافات سے بالاتر ہو کر اسلامی قانون کی تدوین کی راہ ہموار کریں۔ اس سلسلہ میں ادارہ فکر اسلامی کراچی نے نہایت قابل ستائش قدم اٹھایا ہے۔ اس ادارہ نے فقہ کی ایک ایسی کتاب تیار کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے جو پوری اسلامی فقہ کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہو۔ لوگوں کو اصولی و بنیادی اور فروعی و جزئی مسائل میں امتیاز کرنے کا عادی بنانے کے لیے حکمت عملی یہ اختیار کی گئی ہے کہ ایک کتاب میں فقہ کا وہ حصہ مرتب کیا جائے جو قرآن مجید کی نصوص سے ثابت ہے۔ دوسری کتاب فقہ کے اس حصہ پر مشتمل ہو جو سنت اور اجماع سے ثابت ہے۔ کتاب تصنیف کرنے کے لیے ادارہ نے مولانا عمر احمد عثمانیؒ سے رجوع کیا۔ وہ ملک کے معروف دینی و علمی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں اور مولانا ظفر احمد عثمانیؒ مرحوم کے صاحبزادے ہیں اس اعتبار سے ان کا انتخاب نہایت موزوں ہے۔ مولانا نے فقہ القرآن کے نام سے ایک سلسلۂ کتب تیار کر دیا ہے جس کی جلد ششم ہمارے پیش نظر ہے۔

ہمارے نزدیک قرآن اور سنت کو الگ کر کے فقہی مسائل کے استخراج کی حکمت عملی اختیار کرنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ ان دونوں اصل منابع، جو کہ وہ فی الواقع ہیں، کی روشنی میں یکجا بحث کر کے ہر مسئلہ کو منقح کر دینا کافی ہوتا۔ اس حکمت عملی کے نتیجہ میں بلا وجہ مضامین کے تکرار کی شکل پیدا ہو گئی ہے۔ بالآخر اس کوشش کو زیادہ نتیجہ خیز اور مفید بنانے کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ اس کو سائنٹفک بنیادوں پر ایڈٹ کر کے آئندہ ایڈیشنوں میں تکرار سے بچا جائے۔

ہماری قوم کی یہ بدقسمتی ہے کہ جمود اور تقلید کی جڑیں اس قدر گہری ہو چکی ہیں کہ دین کی حدود کے اندر رہتے ہوئے بھی اگر کوئی عالم، خواہ کتنے ہی خلوص کے ساتھ، کوئی نیا فکر عام موقف سے ہٹ کر پیش کرے، تو لوگ اس پر کفر یا کم از کم انکار حدیث کا لیبل چسپاں کرنے میں تاخیر نہیں کرتے۔ مولانا عثمانیؒ کو بھی فقہ القرآن لکھنے پر اسی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ لوگوں نے ان کے دلائل پر غور کرنے کے بجائے کتاب کو پھبتیوں سے اڑانے کی کوشش

کی ہے کہ وہ عقل و استدلال کی جولانی دکھانے کے باوجود فقہا کی تحقیقات کے دائرے کے اندر ہی رہیں۔ چونکہ ہر صحیح بات دلوں میں اپنی جگہ بنا لیتی اور اپنے قدردان پیدا کر لیتی ہے اس لیے مخالفت کے باوجود مولانا عثمانی کے مداحوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو عقلیت پسند ہونے کے ساتھ ساتھ دین کے وفادار ہونے کی شہرت رکھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس نامساعد دور میں کتاب کی یہ تائید بھی کافی ہے۔

جلد ششم میں صرف تین موضوعات یعنی مختلف جرائم و معاملات میں شہادت کے احکام، عورت کی دیت اور اجماع پر بحث کی گئی ہے اور وہ بڑی سیر حاصل ہے۔ فاضل مصنف نے جو طرز استدلال اختیار کیا ہے وہ اسلامی قانون کی تدوین کی راہ ہموار کرنے میں ان شاء اللہ مددگار ثابت ہوگا۔ مولانا موصوف نے قرآن و سنت سے ٹھوس دلائل دے کر ثابت کیا ہے کہ عورت کی شہادت سوائے مالی معاملات کے مرد کی شہادت کے برابر ہے اور اسی طرح عورت کی دیت کی مقدار بھی مرد کی دیت کی مقدار کے برابر ہے۔ مولانا کی رائے سے اختلافات رکھنے کا ہر کسی کو حق ہے مگر ان کی اس جرأت پر انہیں گردن زدنی قرار دینا کسی لحاظ سے بھی قرین انصاف نہیں۔ کتاب کے آخر میں مولانا موصوف نے اجماع کی حقیقت پر ایک مقالہ لکھا ہے جس میں اجماع کے مفہوم، عہد صحابہ اور عہد صحابہ کے بعد اجماع کے سلسلہ میں مذاہب، اجماع کی اقسام اس کے انعقاد اور اس کی حجیت پر سیر حاصل بحث کی ہے اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ زمانہ اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ سابق اجماع سے ثابت شدہ مسائل و احکام میں بھی تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ عورتوں کی شہادت اور دیت کے مسائل اس سے پہلے کی جلدوں میں بھی بیان ہوئے ہیں جن پر ملک میں بحثیں اٹھائی گئیں۔ جلد ششم میں ان بحثوں کا جواب بھی ہے اس لیے زیر نظر کتاب کا طرز تحریر قدرے مناظرانہ رنگ لیے ہوئے ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ اس کے آئندہ ایڈیشن میں معمولی حذف و اضافہ سے اگر یہ سقم دور کر دیا جائے تو اس کتاب کی افادیت بہت بڑھ جائے گی۔ تعارف کتاب کے عنوان سے اس کتاب کی تقریظ جو سولہ صفحات پر مشتمل ہے، جسٹس آفتاب حسین سابق چیف جسٹس وفاقی شرعی عدالت نے لکھی ہے۔ اسی طرح علامہ سعید احمد اکبر آبادی کے قلم سے بھی ایک تعارفی تحریر شامل کتاب ہے۔

۳۸۵ صفحات کی یہ کتاب ادارہ فکر اسلامی کاشانۂ حفیظ نمبر ۲۳۰ گارڈن ایسٹ ایسرداس سٹریٹ کراچی نے شائع کی ہے اور ایس ایم میر چارٹرڈ بینک چیمبر تالپور روڈ کراچی نمبر ۲ سے دستیاب ہے۔ اس کی قیمت ۵۵ روپے ہے۔

خالد مسعود

تفسیر سورۂ آلِ عمران (٦)

اور یہ لوگ تمہارے لیے باعثِ غم نہ بنیں جو کفر کی راہ میں سبقت کر رہے ہیں۔ یہ اللہ کو ہرگز کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ اللہ چاہتا ہے کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے۔ ان کے لیے بڑا عذاب ہے ۞ بے شک جنہوں نے ایمان سے کفر کو بدلا وہ اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑیں[۱۳۴] گے اور ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے ۞ اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے یہ نہ گمان کریں کہ یہ جو ہم ان کو ڈھیل دے رہے ہیں تو یہ ان کے حق میں کوئی بہتر بات ہے، ہم تو بس اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں کہ وہ گناہ میں کچھ اور اضافہ کر لیں اور ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے ۞ ۱۷۸

اللہ یہ نہیں کر سکتا تھا کہ مسلمانوں کو، جس حال پر تم تھے اسی پر، خبیث کو طیب سے الگ کیے بغیر چھوڑے رکھے اور نہ یہ کر سکتا تھا کہ وہ تمہیں سارے غیب سے باخبر کر دے بلکہ اللہ اس کام کے لیے اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کرتا ہے، تو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور اگر تم ایمان لائے اور تم نے تقویٰ اختیار کیا تو تمہارے لیے بہت بڑا اجر[۱۳۵] ہے ۞ ۱۷۹

---

۱۳۴ اُحد کی شکست کے بعد وہ لوگ جو منافقانہ اسلام کی صفوں میں آ گھسے تھے یا تو علانیہ کفر کی طرف پلٹ گئے یا اس طمع خام میں مبتلا ہو گئے کہ قریش کی حمایت کر کے اس دین کو شکست دی جا سکتی ہے چنانچہ ان کی تمام سرگرمیاں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت اور کفر اور اہلِ کفر کی حمایت کے لیے وقف ہو گئیں۔ یہاں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ ان لوگوں کی یہ سرگرمیاں اللہ اور اس کے دین کو ذرا بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گی۔

۱۳۵ اس آیت میں اس حکمت کی طرف اشارہ ہے جو اُحد کی آزمائش میں اہلِ ایمان کے لیے مضمر تھی۔ فرمایا کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی سنت کے خلاف تھی کہ جو جماعت تمام دنیا کی صلاح و فلاح کا ذریعہ بننے والی ہے وہ خام و پختہ، خبیث و

اور جو لوگ بخالت کرتے ہیں اس چیز میں جو اللہ ہی نے ان کو اپنے فضل میں سے بخشی ہے، یہ نہ خیال کریں کہ یہ ان کے حق میں بہت بہتر ہے بلکہ یہ ان کے حق میں بہت برا[۱۳۶] ہے۔ جس چیز میں وہ بخالت کریں گے اس کا قیامت کے دن ان کو طوق پہنایا جائے گا۔ اور اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی وراثت اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے ۞ اللہ نے ان لوگوں کی بات سن رکھی ہے جنہوں نے کہا کہ اللہ محتاج ہے اور ہم غنی ہیں۔ ہم ان کی اس بات کو بھی لکھ رکھیں گے اور ساتھ ہی ان کے ناحق قتلِ انبیاء کو[۱۳۷] بھی، اور کہیں گے کہ اب چکھو عذاب آگ کا ۞ یہ تمہارے اپنے ہی ہاتھوں کی کرتوت ہے، اللہ اپنے بندوں کے ساتھ ذرا بھی ناانصافی کرنے والا نہیں ۞ جنہوں نے کہا کہ اللہ نے ہمیں یہ ہدایت کر رکھی ہے کہ ہم اس وقت تک کسی رسول کی بات باور نہ کریں جب تک وہ قربانی نہ پیش کرے جس کو کھانے کے لیے آگ اترے[۱۳۸]۔ ان سے کہو کہ مجھ سے پہلے تمہارے پاس رسول کھلی کھلی نشانیاں اور وہ چیز بھی لے کر آئے جس کے لیے تم کہہ رہے ہو تو تم نے ان کو قتل کیوں کیا، اگر تم سچے ہو ۞ پس اگر یہ تمہاری تکذیب کرتے ہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، تم سے پہلے بھی رسولوں کی تکذیب ہو چکی ہے جو کھلی ہوئی نشانیاں، صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے ۞ ہر جان کو موت کا مزا چکھنا ہے اور تم پورا پورا اجر تو بس قیامت ہی کے دن پاؤ گے۔ پس جو دوزخ سے بچایا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا وہ کامیاب ہوا۔ اور د...

طیب اور مخلص و منافق ہر قسم کے افراد پر مشتمل ہو۔ اس نے چاہا کہ اس کے فاسد عناصر کو اس سے الگ کیا جائے تاکہ مخلص اہلِ ایمان ابھر کر سامنے آئیں اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق پروان چڑھیں۔

۱۳۶ اہلِ نفاق جس طرح اپنی جان کے معاملے میں چور ہوتے ہیں اسی طرح اپنے مال کے معاملے میں بھی چور ہوتے ہیں۔ یہاں ان کی کمزوری پر تنبیہ فرمائی کہ خدا کے حقوق و فرائض سے چرا چرا کر جو مال جمع کیا جاتا ہے وہ مفید ثابت نہیں ہوگا بلکہ وہ ان کی گردنوں کا بوجھل طوق بنے گا۔

۱۳۷ یہود سے مسلمان ہونے والے بعض منافقین قرآن کی دعوتِ انفاق فی سبیل اللہ کا مذاق اڑاتے ہوئے یہ کہتے کہ اللہ میاں اس قدر غریب ہو گئے ہیں کہ ہم سے قرض مانگنے کی نوبت آ گئی ہے۔ یہ مذاق یہود کی ہمنوائی میں ہوتا تھا۔ لہٰذا ان کے قتلِ انبیاء کے جرم کے ساتھ اس استہزا کو ملا کر فرمایا کہ ان دونوں سنگین جرائم کو ہم بھولنے والے نہیں۔

۱۳۸ یہ بات یہود محض شرارت کی وجہ سے کہتے تھے۔ تورات کی کتاب سلاطین ۱۸ : ۳۷ – ۳۸ میں ایلیا نبی کے متعلق اور تواریخ ۷ : ۱ میں حضرت سلیمانؑ کے متعلق اس معجزے کا صادر ہونا مذکور ہے لیکن اس معجزہ کا لوازم و شرائط نبوت میں سے ہونا کہیں مذکور نہیں۔ بالخصوص آخری نبی سے متعلق ان کے ہاں جو پیشین گوئیاں ہیں وہ اس قسم کے تکلفات سے بالکل خالی ہیں۔

دنیا کی زندگی تو بس دھوکے کا سودا [139] ہے ؏ ۱۸۵

تمہارے مال اور تمہاری جان میں تمہاری آزمائش ہونی ہے اور تمہیں ان لوگوں کی طرف سے جن کو تم سے پہلے کتاب ملی اور ان لوگوں کی طرف سے جنہوں نے شرک کیا بہت سی تکلیف دہ باتیں سننی پڑیں گی۔ اور اگر تم ثابت قدم رہے اور تم نے تقویٰ کو ملحوظ رکھا تو بے شک یہ چیز عزیمت کے احوال [140] میں سے ہے ؏

اور یاد کرو جب کہ اللہ نے ان لوگوں سے عہد لیا جن کو کتاب دی گئی کہ تم لوگوں کے سامنے اس کتاب کو اچھی طرح ظاہر کرنا، اسے چھپانا مت [141]، تو انہوں نے اس کو پس پشت ڈال دیا اور اس کے بدلے میں ایک حقیر قیمت لے لی، کیا ہی بری چیز ہے وہ جسے وہ لے رہے ہیں ؏ جو لوگ اپنی ان کرتوتوں پر مگن ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کاموں پران کو سراہا جائے جو انہوں نے کیے [142] نہیں ان کو عذاب سے بری نہ سمجھو۔ ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے ؏ اور اللہ ہی کے لیے آسمان وزمین کی بادشاہی ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ؏ ۱۸۹

بے شک آسمانوں اور زمین کی خلقت اور رات اور دن کی آمد وشد میں اہل عقل کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں ؏ ان کے لیے جو کھڑے بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر خدا کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی خلقت پر غور کرتے رہتے ہیں۔ ان کی دعا یہ ہوتی ہے کہ اے ہمارے پروردگار، تونے یہ کارخانہ بے مقصد نہیں پیدا کیا ہے۔ تو اس بات سے پاک ہے کہ کوئی عبث کام کرے، سو تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا [143]

---

[139] یعنی یہ دنیا اور اس کی چمک دمک تو محض ایک جلوۂ سراب ہے اور شامت ہی ہے ان کی جو اس کے پیچھے پڑ کر آخرت کو گنوا بیٹھے۔ قیامت کے روز بازی دراصل اس کی ہے جو دوزخ سے محفوظ رہا اور جنت میں داخل ہوا۔

[140] یعنی یہ عزیمت کا وہ مقام ہے جو انبیاء اولوالعزم اور ان کے جاں نثاروں کا خاص حصہ ہے اور بالآخر اس راہ میں کامیابی کی کلید ہے۔

[141] اس عہد کا ذکر تورات اور انجیل دونوں میں مختلف اسلوبوں اور پیرایوں سے ہوا ہے۔ دیکھیے استثنا ۱۱ : ۱۸ - ۲۱ انجیل متی ۱۰ : ۲۸ کا یہ فقرہ خاص طور پر آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے کہ جو کچھ میں تم سے اندھیرے میں کہتا ہوں اجالے میں کہو اور جو کچھ تم کان میں سنتے ہو کوٹھوں پر اس کی منادی کرو۔

[142] یعنی کتاب الٰہی کے اظہار واعلان، اس کی تعلیم وتبیین اور اس کے اجرا ونفاذ کی ذمہ داری کو تو انہوں نے پورا نہیں کیا لیکن ان کی خواہش یہ ہے کہ انہیں حامل کتاب سمجھا جائے۔ انہیں خدا کی برگزیدہ امت قرار دیا جائے اور ان کو دنیا اور آخرت دونوں میں خدا کے تمام فضل وانعام اور لطف واحسان کا حق دار مانا جائے۔

[143] یعنی معجزے اور کرشمے تلاش کرنے والوں کے لیے اس کائنات میں خدا کی قدرت وحکمت کی نشانیوں کی کوئی کمی نہیں

اے ہمارے رب، جس کو تونے دوزخ میں ڈالا بے شک اس کو تونے رسوا کردیا۔ اور ظالموں کا کوئی بھی مددگار نہ ہوگا ؏ اے ہمارے رب، ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا ایمان کی دعوت دیتے کہ لوگو، اپنے رب پر ایمان لاؤ، تو ہم ایمان لائے۔ اے ہمارے رب، ہمارے گناہوں کو بخش دے، ہماری برائیوں کو ہم سے دور کردے اور ہمیں موت اپنے وفادار بندوں کے ساتھ دے ؏ اے ہمارے رب، اور ہمیں بخش وہ کچھ جس کا تونے اپنے رسولوں کی زبانی ہم سے وعدہ فرمایا ہے اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کیجیو، بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرنے [144] کا ؏ ۱۹۴

تو ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول فرمائی کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا، مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے [145] سے ہو۔ سو جنہوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکالے اور ہماری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے ہیں۔ ان سے ان کے گناہ دور کردوں گا اور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ یہ اللہ کے پاس سے ان کا بدلہ ہوگا اور بہترین بدلہ تو اللہ ہی کے پاس ہے ؏ ۱۹۵

اور ملک کے اندر کافروں کی یہ سرگرمیاں تمہیں کسی مغالطہ میں نہ ڈالیں ؏ یہ چند دن کی چاندنی [146] ہے

لیکن ان کو دیکھنے کے لیے بیدار عقل اور بیدار دل کی ضرورت ہے۔ ایسے ارباب بصیرت کا ذکر وفکر خود بخود ان کو اس نتیجے تک پہنچا دیتا ہے کہ یہ عظیم کارخانہ بے غایت وبے مقصد نہیں ہو سکتا۔ ضروری ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا جس میں گنہگار اور نیکوکار دونوں اپنے اپنے اعمال کا بدلہ پائیں اور اس دنیا کی خلقت میں جو عظیم حکمت پوشیدہ ہے وہ ظاہر ہو۔

[144] یہ اولوالالباب کا رویہ بیان ہوا ہے جو وہ اللہ کے رسول اور اس کی دعوت کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں۔ نہ وہ کٹ حجتیاں کرتے، نہ خوارق ومعجزات مانگتے۔ پیغمبر کی دعوت خود ان کے دل کی آواز ہوتی ہے۔ اولوالالباب کی طرف سے حق کی یہ تائید دعا کی شکل میں سامنے آئی ہے۔ گویا وہ اپنے ایمان کی ذمہ داریوں اور اس کی مشکلات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس وجہ سے انہوں نے اپنے آپ کو نہایت عاجزی اور فروتنی کے ساتھ اپنے رب کے آگے ڈال دیا ہے کہ وہ انہیں مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق دے۔

[145] یہ تمام اہل ایمان کی حوصلہ افزائی ہے جو دعوت اسلامی کے اس نازک مرحلے میں اس کی تائید کے لیے خطرات سے بے پروا ہوکر اٹھ کھڑے ہوتے تھے، خواہ وہ آزاد تھے یا غلام، مرد تھے یا عورت۔ اللہ تعالیٰ کی میزان میں سب کا عمل یکساں وزن رکھتا تھا۔

[146] یعنی اس وقت کفار اپنی سطوت کے گھمنڈ میں ہر جگہ جو دندناتے پھر رہے ہیں اور کمزور مسلمانوں پر ظلم ڈھا رہے ہیں

پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کیا ہی بری جگہ ہے۔ البتہ وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈرتے رہے ان کے لیے ایسے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کی طرف سے ان کے لیے پہلی میزبانی ہوگی۔ اور جو کچھ اللہ کے پاس اس کے وفادار بندوں کے لیے ہے وہ کہیں بہتر ہے۔ ۱۹۸

اور بے شک اہل کتاب میں سے ایسے بھی ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو تم پر اتارا گیا اور اس پر بھی جو ان پر اتارا گیا ہے۔ اللہ سے ڈرتے ہوئے۔ وہ اللہ کی آیتوں کا حقیر قیمت پر سودا نہیں کرتے۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر[۱۴۷] ہے۔ بے شک اللہ جلد حساب چکانے والا ہے۔ ۱۹۹

اے ایمان والو، صبر کرو[۱۴۸]، ثابت قدم رہو، مقابلے کے لیے تیار رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم کامیاب ہو۔ ۲۰۰

اس سے کوئی مغالطہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ چمک دمک محض چند روزہ ہے۔ ان کو جو عارضی مہلت ملی ہوئی ہے اس کے بھی مصالح ہیں لیکن یہ مہلت بہت جلد ختم ہو جانے والی ہے۔ انجام کار کی کامیابی خدا کے متقی اور وفادار بندوں ہی کے لیے ہے۔

۱۴۷ یہ اہل کتاب کے اس گروہ کی تحسین ہے جو معاندین کے برعکس حق پر قائم رہا اور اسی نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی توفیق پائی۔ فرمایا کہ یہ لوگ اپنی اس استقامت اور حق پرستی کا انعام پائیں گے۔

۱۴۸ حالات و مشکلات سے عہدہ برا ہونے کے لیے مسلمانوں کو چار چیزوں کی ہدایت فرمائی۔ پہلی صبر یعنی مزاحمتوں کے مقابل میں حق پر جمے رہنا، دوسری مصابرت یعنی حریف کے مقابل میں استقلال و پامردی کے دعت میں بازی لے جانا، تیسری مرابطہ یعنی دشمن کے مقابلہ کے لیے مادی تیاری اور چوتھی تقویٰ یعنی خدا کے مقرر کردہ حدود و قیود کی اخلاص و خشیت کے ساتھ نگرانی۔

خالد مسعود

تحقیق حدیث میں صحابہ کرامؓ کا طرزِ عمل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول و فعل دین میں جو مقام رکھتا ہے اور جس طرح حجت شرعی ہے یہ امت کے مسلّم امور میں سے ہے۔ سواد امت نے اس سے کبھی اختلاف نہیں کیا۔ آنحضرتؐ کے قول و فعل کی اسی اہمیت کی وجہ سے آپ کی طرف غلط طور پر کوئی بات منسوب کرنے کو اتنا بڑا جرم قرار دیا گیا کہ اس کا بدلہ جہنم ہے۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا

اِنَّ كَذِبًا عَلَيَّ لَيْسَ كَكَذِبٍ عَلَىٰ اَحَدٍ فَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ

(میری طرف جھوٹی بات منسوب کرنا کسی دوسرے شخص کی طرف جھوٹ منسوب کرنے کی مانند نہیں۔ جس شخص نے میری طرف جھوٹ منسوب کیا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے) آنحضرتؐ کی طرف غلط نسبت سے متعلق اس وعید کا یہ تقاضا تھا کہ ہر زمانے کے مسلمان حدیث رسول کے معاملہ میں نہایت بیداری کا ثبوت دیتے۔ چنانچہ مختلف ادوار میں حدیث کے متعدد علوم وجود میں آئے جن کے ذریعے ہر اس قول یا فعل کی روایت کو پرکھنے کا اہتمام کیا گیا جس کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی۔ ہر دور کی الگ خصوصیات اور حدیث کے لیے منفرد خدمات ہیں۔ لیکن یہ جاننا ہمارے لیے خصوصاً بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ تحقیق حدیث میں صحابہ کرامؓ کا طرزِ عمل کیا تھا۔

صحابہ کرام حدیث رسول کے بڑے شیدائی تھے۔ اس کی طلب میں بڑی سرگرمی دکھاتے تھے اور جس معاملے میں ان کو حضور کا کوئی قول یا فعل میسر آ جاتا تو وہ اپنی ذاتی رائے سے فوراً دستبردار ہو جاتے اور اسی سے رہنمائی حاصل کرتے۔ آنحضرتؐ کے انتقال کے فوراً بعد پیدا ہونے والے بعض اہم مسائل کا فیصلہ صحابہؓ نے ان روایات کی روشنی میں کیا جو حضرت ابوبکرؓ نے برسر موقع پیش کیں۔ مثلاً حضور کی قبر کی جگہ کے انتخاب کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے حدیث بیان کی کہ نبی جہاں وفات پاتا ہے اسی جگہ اس کی قبر بنتی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں نے حجرۂ عائشہؓ ہی میں قبر مبارک تیار کی۔ مسلمانوں کی سربراہی کے مسئلہ پر جب جذبات میں گرما گرمی پیدا ہو گئی اور انصار نے اپنے اندر سے امیر بنانے کا استحقاق جتایا تو سیدنا ابوبکرؓ نے یہ حدیث سنائی کہ سربراہ قریش میں سے ہوں گے۔ اس حدیث کو سن کر انصار پرسکون ہو گئے۔ جب امہات المومنینؓ اور حضرت فاطمہؓ نے

رسول اللہؐ کی وراثت کی تقسیم کا مطالبہ کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرتؐ کا یہ فرمان سنایا کہ ہم گروہِ انبیاء کی وراثت نہیں ہوتی جو کچھ ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ یہ فرمان سن کر سب نے اپنا دعوےٰ واپس لے لیا۔ علیٰ ہذا القیاس صحابہ کرام نے سینکڑوں روایتیں بیان کیں جن کو ان کے ہمعصر صحابہ نے بغیر رد و قدح کے قبول کیا اور یہ روایت اب حدیث کی ہر کتاب میں موجود ہیں ۔

صحابہ کرامؓ کی روایتِ حدیث میں بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ راوی سے کوئی تسامح ہو گیا، کسی روایت کے الفاظ میں تغیر و تبدل ہو گیا یا راوی نے موقع محل کو نہیں سمجھا اور حدیث کو غلط موقع پر منطبق کر دیا یا سننے والوں نے روایت کے الفاظ میں کسی طرح کا شبہ ظاہر کیا۔ اس صورت میں صحابہ یا تو اس روایت کی مزید تحقیق کرتے یا اس کو اصول کی بنیاد پر پرکھ کر فیصلہ کرتے۔ اس بارے میں خاص طور پر قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اگر ایسی روایت کسی جلیل القدر صحابی کی جانب سے بھی آئی تو ان کے علوِ مرتبت سے مرعوب ہو کر معاملہ سے صرفِ نظر نہیں کیا گیا بلکہ حدیثِ رسول کی صحت کا حق فائق سمجھا گیا اور اس کی تحقیق کی گئی۔ ایک موقع پر حضرت عائشہ صدیقہؓ نے حضرت عمرؓ کی ایک روایت پر گرفت کی تو فرمایا: انکم لتحدثونی من غیر کاذبین ولا مکذبین ولکن السمع تخطی" (تم میرے پاس ایسے لوگوں سے حدیث بیان کرتے ہو جو نہ جھوٹے ہیں اور نہ جھٹلائے گئے ہیں لیکن بات سننے میں غلطی ہو جاتی ہے)

صحابہ کرامؓ کے مبارک زمانے میں روایانِ حدیث معلوم و مشہور اور ان کی صحابیت ثابت تھی اس لیے اسناد کا مسئلہ ان کے لیے پیدا نہ ہوا تھا۔ البتہ متنِ احادیث کے ضمن میں کئی بحثیں پیدا ہوئیں جن کے مطالعہ سے ہم یہ جان سکتے ہیں کہ متنِ حدیث کی تحقیق میں صحابہ کرامؓ کن چیزوں کو رہنما بناتے تھے۔ اس بارے میں تمام روایات کا استقصا مطلوب نہیں، اس لیے ذیل میں صحاح کی چند ایسی روایات پیش کی جا رہی ہیں جن میں صحابہ کرامؓ کے مابین بحثیں پیدا ہوئیں اور جو ان کے نہجِ تحقیق کو واضح کرنے کے لیے فی الجملہ کافی ہیں۔ چونکہ اس مضمون کا دائرہ ان روایات میں بیان کردہ اختلافی مسئلہ کی تحقیق تک وسیع نہیں بلکہ صرف یہ جاننے تک محدود ہے کہ بحث کس بنیاد پر اٹھائی گئی۔ اس لیے ہم ان کوششوں کے بیان سے صرفِ نظر کریں گے جو بعد کے ادوار میں مسئلہ کی تحقیق کے لیے کی گئیں۔

درست روایت کی نشاندہی:

۱۔ حضرت عائشہؓ کو سیدنا عمرؓ کی یہ روایت پہنچی کہ ان المیت یُعَذَّبُ ببکاءِ اھلِہٖ (اہلِ خانہ کے رونے کے باعث میت کو عذاب دیا جاتا ہے) تو انہوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ عمرؓ پر رحم فرمائے۔ رسول اللہؐ نے ہرگز ایسا نہیں فرمایا تھا۔ بات یوں تھی کہ آنحضرتؐ کا گزر ایک یہودیہ کی قبر پر ہوا جس کے لواحقین رو رہے تھے اس

پر آپؐ نے فرمایا تھا کہ قبر میں اس کو عذاب ہو رہا ہے اور اہلِ خانہ اس پر رو رہے ہیں۔ اس وضاحت سے حضرت عائشہؓ نے یہ بتایا کہ آنحضرتؐ کا ارشاد ایک خاص موقع کے لیے تھا لیکن روایت کرتے وقت اس کو عام قاعدہ سمجھ لیا گیا جو منشائے نبوی نہ تھا (مسلم، کتاب الجنائز، باب المیت یعذب ببکاء اہلہ علیہ)

۲۔ سہل بن ابی حثمہؓ نے روایت بیان کی کہ ایک انصاری خیبر میں مقتول پائے گئے ان کے ساتھیوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہود کو قتل کا الزام دیا، آنحضرتؐ نے اس کا ثبوت مانگا جو ان کے پاس نہ تھا تو آپ نے ان سے کہا کہ تب یہود کے پچاس آدمی قسم کھائیں گے کہ انہوں نے قتل نہیں کیا۔ انصار نے کہا کہ انہیں یہود کی قسم کا کوئی اعتبار نہیں چنانچہ آنحضرتؐ نے اپنے پاس سے مقتول کی دیت ادا کر دی۔ اس پر عبدالرحمٰن بن بجیدؓ نے واقعہ کی صحیح نوعیت یہ بتائی کہ انصاری کے قتل کے بعد رسول اللہؐ نے اہلِ خیبر سے باز پرس کی اور دیت ادا کرنے کو کہا۔ اس پر انہوں نے پچاس آدمیوں کی قسم کے ساتھ بتایا کہ نہ انہوں نے قتل کیا اور نہ اس کا انہیں علم ہے چنانچہ آنحضرتؐ نے مقتول کی دیت ادا کر دی۔

۳۔ ابوہریرہؓ نے روایت بیان کی کہ لان یمتلیٔ جوف احدکم قیحا ودما خیر لہ من ان یمتلیٔ شعراً" (تم میں سے کسی کا پیٹ پیپ اور خون سے بھر جائے تو اس سے کہیں اچھا ہے کہ وہ شعروں سے بھر جائے) حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ ابوہریرہ نے حدیث کو پورا یاد نہیں رکھا۔ اس کے آخری الفاظ یہ تھے "ان یمتلیٔ شعرا ھجیت بہ" (ایسے شعروں سے بھر جائے جن سے تم ہجو کرتے پھرو) یہاں حدیث کے الفاظ نا تمام نقل ہونے سے مفہوم بدل گیا جس کو حضرت عائشہؓ نے اپنی وضاحت سے درست کر دیا۔ معلوم ہوا کہ صحابہ کے سامنے جب کوئی ایسی روایت آتی جس میں اضطراب، انحراف یا کمی بیشی کا کوئی پہلو ہوتا جو سننے والوں کے علم میں ہوتا تو وہ فوراً راوی کے تسامح کو دور کر کے روایت کو درست کر دیتے۔

نصِ قرآنی کی روشنی میں تنقید:

۱۔ کعبؓ احبار نے روایت بیان کی کہ حضرت موسیٰؑ نے دو مرتبہ اللہ تعالیٰ سے کلام کیا اور رسول اللہؐ نے دو مرتبہ ذاتِ باری تعالیٰ کا مشاہدہ کیا، مسروق نے حضرت عائشہؓ سے استفسار کیا کہ کیا واقعی رسول اللہؐ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ تمہاری یہ بات سن کر تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں۔ جو شخص یہ کہے کہ رسول اللہؐ نے اپنے رب کو دیکھا تھا وہ اللہ پر ایک بہتان لگاتا ہے۔ کیا تم نے قرآن مجید کی یہ آیات نہیں سن رکھی ہیں کہ لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ (نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں) اور مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَہُ اللّٰہُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ (کسی بشر کی یہ حیثیت نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کی صورت میں یا پردے کے پیچھے سے) یہاں حضرت عائشہؓ کا استدلال یہ تھا کہ ان آیات کی رو سے جب

کسی بشر کے لیے ذاتِ باری تعالیٰ کا مشاہدہ ممکن ہی نہیں تو آنحضرتؐ کی رویت کی یہ روایت کیسے صحیح ہو سکتی ہے ! (مسلم کتاب الایمان، باب بل رای النبی ربہ)

۲۔ حضرت عائشہؓ کے سامنے روایت بیان کی گئی اَلطِّیَرَۃُ مِنَ الدَّارِ وَالْمَرْأَۃِ وَالْفَرَسِ (بدفالی مکان، عورت اور گھوڑے میں ہوتی ہے) اس پر وہ غضبناک ہوئیں اور فرمایا اس ذات کی قسم جس نے محمدؐ پر فرقان اتارا۔ رسول اللہ نے ہرگز یہ نہیں فرمایا۔ آپ کا ارشاد تو یہ تھا کہ دورِ جاہلیت میں لوگ مکان عورت اور گھوڑے سے بدشگونی لیتے تھے۔ ہمیں تو قرآن مجید سے یہ تعلیم ملی ہے کہ مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَا (الحدید ۲۲) (تمہیں کوئی مصیبت نہیں پہنچتی، نہ زمین میں اور نہ تمہارے نفوس کے اندر مگر یہ کہ ایک کتاب میں لکھی ہوتی ہے اس سے پہلے کہ ہم اس کو وجود میں لائیں) یہاں آپ نے نہ صرف روایت کو درست شکل میں بیان کر دیا بلکہ یہ بھی واضح کیا کہ ابوہریرہؓ کی روایت نصِ قرآنی کے خلاف ہو گئی ہے اس لیے یہ قبول نہیں کی جا سکتی۔

۳۔ فاطمہؓ بنت قیس نے بیان کیا کہ ان کے شوہر ابو عمروؓ بن حفص نے ان کو یمن سے تیسری طلاق بھجوائی اور طلاق کے ساتھ کچھ مال دینے کی ہدایت اپنے عزیزوں کو کر دی۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہم فاطمہ کو نفقہ کا حقدار نہیں سمجھتے جب تک وہ حاملہ نہ ہو۔ نبیؐ سے حکم پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا اس کے لیے نفقہ ہے نہ رہائش۔ فاطمہ کی یہ روایت حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوئی تو آپ نے فرمایا ہم ایک خاتون کی روایت کی بنا پر کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کو نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم نہیں جانتے کہ اس نے بات کو یاد رکھا یا بھلا دیا جبکہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِن بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَن يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ (مطلقہ عورتوں کو ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ ہی وہ خود نکلیں بجز اس صورت کے کہ وہ کسی واضح بے حیائی کی مرتکب ہوئی ہوں (مسلم کتاب الطلاق۔ باب المطلقۃ ثلاثا) یہاں نصِ قرآنی کی روشنی میں سیدنا عمرؓ نے فاطمہ بنت قیس کی روایت کو قابلِ اعتبار نہ سمجھا۔

۴۔ ابن عمرؓ نے روایت بیان کی کہ رسول اللہؐ نے مقتولین قریش کو بدر کے میدان میں دفن کرایا تو ان کو مخاطب کر کے پوچھا تمہارے رب نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اس کو تم نے اب حقیقت پا لیا نا؟ پھر فرمایا 'انہم لیسمعون الآن ما اقول لہم' (اس وقت میں ان سے جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ اس کو سن رہے ہیں) حضرت عائشہؓ نے جب یہ روایت سنی تو فرمایا۔ ابن عمرؓ سے بھول ہو گئی آنحضرتؐ کے الفاظ یہ تھے کہ 'انہم الآن لیعلمون ان الذی کنت اقول لہم ہو الحق' (اس وقت ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ میں ان سے جو کچھ کہا کرتا تھا وہی حقیقت تھا) پھر آپ نے قرآن سے استدلال کرتے ہوئے یہ آیت پڑھی

وَمَا أَنتَ بِمُسْمِعٍ مَّن فِي الْقُبُورِ (جو قبروں میں ہیں ان کو تم سنانے والے نہیں ہو) گویا آپ کا استدلال یہ تھا کہ جب قرآن قبر والوں کے سننے کی نفی کر رہا ہے تو آنحضرتؐ یہ کیسے کہہ سکتے تھے کہ کفار میری یہ بات سن رہے ہیں۔

۵۔ اور اہلِ خانہ کے گریہ و بکا پر میت کے عذاب والی جو روایت بیان کی گئی ہے اس پر گرفت کرتے ہوئے بھی حضرت عائشہؓ نے آیت وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ نہ اٹھائے گی) سے استدلال کیا کہ اگر رونے والے روتے ہیں تو مرنے والا ان کے گناہ کا ذمہ دار کیوں ہونے لگا:

سنتِ رسولؐ کی روشنی میں تنقید:

مذکورہ پانچ روایات میں صحابہ کرامؓ نے متنِ حدیث کی مطابقت قرآن مجید کی نصوص کے ساتھ دیکھی اور اس کی بنا پر روایت کے اضطراب کو واضح کیا۔ اب چند روایات ملاحظہ کیجیے جن میں ان کی مطابقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور سنتِ معلومہ کے ساتھ دیکھی گئی اور اگر سنت کے جاننے کا زیادہ مضبوط ماخذ میسر ہو سکتا تھا تو اس کی طرف رجوع کیا گیا۔

۱۔ صحابہ کے ایک گروہ میں یہ بات پھیل گئی کہ آدمی قضائے حاجت کے لیے بیٹھے تو اس کو اپنا رخ قبلہ یا بیت المقدس کی طرف نہیں کرنا چاہیے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے سنا تو اپنا ذاتی مشاہدہ یوں بیان کیا کہ میں ایک مرتبہ اپنی ہمشیرہ ام المومنین حضرت حفصہؓ کے گھر کی چھت پر چڑھا۔ دیکھا تو آنحضرتؐ قضائے حاجت کے لیے بیٹھے تھے اور آپ کا رخ بیت المقدس کی سمت کو تھا۔ گویا آپ کا یہ عمل اس بات کا شاہد ہے کہ بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کی ممانعت کی روایت صحیح نہیں (مسلم کتاب الطہارۃ۔ باب الاستطابۃ)

۲۔ ابوہریرہؓ نے روایت بیان کی کہ اگر کسی شخص کو جنابت کی حالت میں فجر ہو جائے تو وہ روزہ نہ رکھے۔ یعنی روزہ کے درست ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ابتدائے سحر سے پہلے غسل کر لیا جائے۔ عبدالرحمٰن بن حارثؓ اس کی تحقیق کے لیے حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کی خدمت میں گئے۔ انہوں نے بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جنابت کی حالت میں اگر فجر ہو جاتی تو آپ روزہ رکھ لیا کرتے تھے۔ اس طرح ابوہریرہؓ کی روایت آنحضرتؐ کے عمل کے خلاف ہوئی۔ (مسلم۔ کتاب الصوم، باب صحۃ صوم من طلع علیہ الفجر وہو جنب)

۳۔ ابن عباسؓ نے بیان کیا کہ اگر کوئی شخص ہدی کا جانور مکہ بھیجے تو جب تک وہ قربان نہیں ہو جائے گا بھیجنے والے پر وہ پابندیاں ہوں گی جو احرام کی حالت میں ہوتی ہیں۔ ابن زیاد نے ہدی کا جانور مکہ بھیجا

چاہا تو اس بارے میں حضرت عائشہؓ سے بھی ان کی رائے دریافت کی۔ آپ نے جواب دیا کہ میں نے اپنے ہاتھوں سے اون کے پٹے بٹ کر جانور کے گلے میں ڈالے اور رسول اللہؐ نے وہ جانور مکہ بھیجا لیکن آپ نے اپنے اوپر ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی جو مُحرم پر ہوتی ہے گویا ابن عباس کا قول رسول اللہؐ کی سنت معروفہ کے خلاف تھا۔ (مسلم کتاب الحج، باب استحباب بعث الہدی الی الحرم)

۴۔ ابوذرؓ نے روایت بیان کی کہ آدمی نماز کے لیے کھڑا ہو تو اسے کجاوے کی پچھلی لکڑی کے برابر اونچا سُترہ اپنے آگے رکھ لینا چاہیے ورنہ گدھا، عورت اور کتا اس کی نماز کاٹ سکتا ہے۔ یہ سن کر ابن عباسؓ نے بیان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں نماز پڑھا رہے تھے۔ میں ایک گدھی پر سوار آیا اور صف کے سامنے گدھی کو چرتا چھوڑ کر خود نماز میں شریک ہو گیا۔ میرے اس عمل پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ گویا اگر ایسی کوئی تعلیم ہوتی تو لازماً مجمع میں سے میرے خلاف آوازیں بلند ہوتیں یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجھے ٹوکتے۔ ابوذرؓ کی روایت حضرت عائشہؓ نے سُنی تو اس پر یوں تبصرہ کیا کہ کیا ہی بُری بات ہے کہ آپ لوگوں نے ہم عورتوں کو کتوں اور گدھوں کے برابر قرار دے دیا۔ میرا مشاہدہ تو یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے ہوتے اور میں آپ کے بالکل سامنے اس طرح لیٹی ہوتی جس طرح جنازہ رکھا ہوتا ہے پس عورت کے سامنے ہونے سے نماز فاسد ہونے کی روایت رسول اللہ کے عمل کے خلاف ہونے کے باعث صحیح نہیں ہو سکتی۔ (مسلم کتاب الصلوٰۃ باب سترۃ المصلی و باب قدر ما یستر المصلی و باب الاعتراض بین یدی المصلی)

۵۔ حضرت عمرؓ لوگوں کو نمازِ عصر کے بعد غروبِ آفتاب تک نماز پڑھنے سے روکتے تھے۔ عبداللہ بن عباسؓ عبدالرحمٰن بن ازہرؓ اور مسور بن مخرمہؓ نے اس بارے میں حضرت عائشہؓ سے استفسار کیا۔ انہوں نے کہا کہ حضرت عمرؓ کو غلط فہمی ہوئی ہے آنحضرتؐ نے صرف طلوع و غروبِ آفتاب کے اوقات میں نماز پڑھنے سے روکا تھا۔ مزید تحقیق کے لیے آپ نے ان لوگوں کو حضرت ام سلمہؓ کے پاس جانے کو کہا۔ حضرت ام سلمہؓ نے بیان کیا کہ ایک دفعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ عصر کے بعد گھر میں نماز پڑھنے لگے۔ اس کا سبب پوچھا گیا تو فرمایا کہ آج وفد عبدالقیس کی مصروفیت میں نمازِ ظہر کے بعد کی دو رکعت نماز رہ گئی تھی، میں اس کی قضا ادا کر رہا تھا۔ گویا آنحضرتؐ کا عمل اس بات کا شاہد ہے کہ نمازِ عصر کے بعد نماز پڑھنے کی مطلق نہی نہیں ہے۔ (مسلم کتاب الصلوٰۃ باب لا تحروا بصلوٰتکم طلوع الشمس و باب معرفۃ الرکعتین بعد العصر)

اصولِ دین یا عقلِ عام کی روشنی میں تنقید:

متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام بسا اوقات کسی روایت کو اس بنا پر قبول نہ کرتے کہ وہ کسی اصول

دین سے ٹکرا رہی ہوتی یا عقلِ عام کے خلاف ہوتی۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ معقلؓ بن سنان نے روایت بیان کی کہ ہمارے قبیلہ کی ایک عورت بروع بنت واشق کا نکاح ہوا۔ ابھی نہ اس کے مہر کا تعین ہوا تھا نہ رخصتی ہوئی تھی کہ اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ رسول اللہؐ نے اس عورت کو مہر مثل کا حقدار گردانا۔ حضرت علیؓ نے معقل کی یہ روایت اس بنا پر قبول نہ کی کہ یہ اس اصول کے خلاف تھی جو اس کی مماثل صورت حال میں مطلقہ کو مہر مثل کا نہیں بلکہ حسب استطاعت کچھ دینے دلانے کا حقدار قرار دیتا ہے۔

مَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ. (البقرہ - ۲۳۶) (ان کو دے دلا کر رخصت کرو، صاحبِ وسعت اپنی وسعت کے مطابق اور غریب اپنی حالت کے مطابق)۔

۲۔ زید بن ثابتؓ اور ابوہریرہؓ نے روایت بیان کی کہ جس چیز کو آگ نے چھو لیا اس کے کھانے سے وضو کی تجدید لازم ہو جاتی ہے۔ اس پر ابن عباسؓ نے کہا کہ جس چیز کو میں کتاب اللہ میں حلال پاتا ہوں کیا محض آگ پر گرم ہونے کی وجہ سے اس کے لیے مجھے نیا وضو کرنا ہوگا؟ پھر اپنا مشاہدہ بیان کیا کہ آنحضرتؐ نے وضو کیا۔ پھر حضرت میمونہؓ کے ہاں گوشت کھایا اس کے بعد تجدید وضو کے بغیر نماز پڑھی۔ اس طرح کا مشاہدہ عمروؓ بن امیہ اور ابو رافعؓ نے بھی بیان کیا۔ (مسلم کتاب الطہارۃ، باب الوضوء مما مست النار و باب نسخ الوضوء)

۳۔ ابوہریرہؓ نے روایت بیان کی کہ تین آدمی بہت برے ہیں اور ان میں بدترین ولد الزنا یعنی حرامی بچہ ہے۔ ابن عباسؓ نے اس روایت کو درست نہیں مانا اور کہا کہ اگر ولد الزنا ایسا ہی برا ہوتا تو اس کی ماں کے رحم میں وضع حمل تک تاخیر کا حکم نہ دیا گیا ہوتا!

خلفائے راشدین کا محتاط رویّہ:

جن معاملات میں قرآن کا کوئی حکم نہ ہوتا اور اصول دین کی روشنی میں مسئلہ حل نہ ہو سکتا اور کوئی صحابی ان معاملات میں کوئی شاذ روایت بیان کر دیتے تو خلفائے راشدین اس کی تحقیق مزید کے لیے ان سے ثبوت بھی طلب کر لیتے۔ اس کی بعض مثالیں ملاحظہ کیجیے۔

۱۔ ابن ابی ذؤیب سے روایت ہے کہ ایک دادی پوتے کی میراث میں سے اپنے حق کا مطالبہ لے کر حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں آئی۔ آپ نے فرمایا کتاب اللہ میں مجھے اس بارے میں کوئی رہنمائی نہیں ملتی اور سنت رسول میں بھی کوئی ایسی چیز میرے علم میں نہیں ہے۔ اس لیے جاؤ میں مشورہ کر کے کوئی فیصلہ کروں گا۔ آپ نے صحابہ کے اندر یہ سوال اٹھایا تو مغیرہ بن شعبہؓ نے بتایا کہ رسول اللہ نے دادی کو چھٹے حصے کا حق دیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا، کیا اس واقعہ کا کوئی اور شاہد ہے؟ اس پر محمد بن مسلمہ انصاریؓ کھڑے ہوئے اور مغیرہ کی

۱۔ ابو موسیٰ اشعریؓ حضرت عمرؓ سے ملنے گئے، دروازے پر تین مرتبہ اجازت مانگی، جب آپ کو کوئی جواب نہ ملا تو لوٹ گئے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو بلا بھیجا اور واپس جانے کا سبب دریافت کیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ رسول اللہؐ کا ارشاد ہے کہ آنے والا اہلِ خانہ سے تین مرتبہ اجازت طلب کرے۔ اگر اجازت مل جائے تو بہتر ورنہ لوٹ جائے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس حدیث کا ثبوت لائیے، وہ گئے اور اُبیؓ کو ساتھ لے کر آئے، اُبیؓ نے گواہی دی اور کہا کہ عمر! آپ رسول اللہؐ کے اصحاب کے لیے عذاب نہ بن جائیے۔ آپ نے فرمایا میں ابوموسیٰ کو متہم نہیں کر رہا بلکہ رسول اللہؐ کی طرف کسی قول کی نسبت کا معاملہ ہے ہی بڑا سنگین۔ اگر میں ایسا نہ کروں تو لوگ آپ کی طرف غلط باتیں منسوب کرنے لگیں گے (سنن ابو داؤد، باب کم مرة یسلم الرجل فی الاستیذان)

۲۔ مسور بن مخرمہؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے جنین کی دیت کے بارے میں صحابہ سے مشورہ کیا۔ مغیرہؓ بن شعبہ نے روایت بیان کی کہ اس صورت میں رسول اللہؐ نے ایک لونڈی یا غلام آزاد کرنے کا حکم دیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اس پر گواہ لاؤ چنانچہ محمد بن مسلمہؓ نے گواہی دی۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ عہدِ عمر فاروقؓ میں جب قرآن مجید کو مدون کیا گیا تو اس کی ہر آیت کے الفاظ ترتیب اور سیاق و سباق پر دو صحابہ کی گواہی لازم قرار دی گئی۔ معلوم ہوتا ہے شیخینؓ کے نزدیک سنتِ رسول کی روایت میں بھی پسندیدہ روش یہی تھی کہ اس کے کم سے کم دو گواہ ہوں۔ اگر تدوینِ حدیث کے دور میں یہی شرط ائمہ محدثین بھی ملحوظ رکھتے تو احادیث کے ایسے مجموعے تیار ہو جاتے جن کی صحت کا معیار بہت بلند ہوتا۔

حضرت علیؓ کا قول ہے کہ میرا معمول یہ تھا کہ میں خود رسول اللہؐ سے کوئی حدیث سنتا تو حسبِ توفیق اس پر عمل کرتا اور اس سے فائدہ اٹھاتا لیکن جب کوئی دوسرا شخص مجھ سے روایت نقل کرتا تو میں اس سے حلف لیتا جب وہ قسم کھا لیتا تو میں اس کی روایت کو صحیح تسلیم کر لیتا۔ حضرت علیؓ کا یہ طرزِ عمل بھی شیخینؓ کے طرزِ عمل کے مماثل ہے، دوسرے شاہد کی عدم موجودگی میں حلف ہی سے روایت کے مضمون کو موکد کیا جا سکتا ہے۔

حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت میں منافقین کو جو قوت حاصل ہوئی اور اس کے بعد مسلمانوں کے اندر گروہ بندی کو فروغ حاصل ہوا تو آنحضرتؐ کی واضح ہدایات اور وعید کے باوجود لوگوں نے روایت حدیث میں احتیاط کا دامن چھوڑ دیا۔ چونکہ رسول اللہؐ کی طرف منسوب ہر بات میں مسلمانوں کے لیے بڑی کشش تھی، اس لیے ان روایات کا بھی چرچا ہونے لگا جو منافقین اور فرقہ پرستوں نے پھیلانی شروع کیں۔ اس صورتحال میں بھی بزرگ صحابہ اپنا فرض نہیں بھولے بلکہ معاملہ کی سنگینی کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کراتے رہے۔ چنانچہ امیر معاویہؓ اپنے خطبوں میں برابر لوگوں کو ایسی روایات سے خبردار کرتے رہتے جو حضرت عمرؓ کے دور تک شائع نہ ہوئی تھیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ حضرت عمرؓ صحتِ روایت کا لوگوں کو احساس دلاتے رہتے تھے، اس

لیے ان کے زمانے تک لوگ محتاط رہے۔ ان کے بعد گروہ بندی کے باعث نئی نئی باتیں رسول اللہؐ کی طرف منسوب کی جانے لگیں۔ ان باتوں کو بلا تحقیق قبول کر لینا دین کے لیے خطرناک تھا۔

روایات میں سند پر انحصار کا آغاز :

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے جب کوئی شخص مشتبہ روایت بیان کرتا تو اس کی باتوں پر توجہ نہ دیتے۔ بشیر عدوی ان کے پاس آئے اور حدیثیں بیان کرنے لگے۔ ابن عباسؓ نے ان کی باتوں پر کان نہیں دھرا۔ اس پر انہوں نے کہا، ابن عباس، میں حدیث روایت کر رہا ہوں اور آپ سن نہیں رہے ہیں؟ ابن عباس نے جواب دیا۔ ایک وقت تھا کہ جب کوئی شخص قال رسول اللہ کہتا تو ہماری نگاہیں فوراً اس کی طرف اٹھ جاتیں اور ہم ہمہ تن گوش ہو کر اس کی بات سنتے۔ جب سے لوگوں نے ہر طرح کی قوی و ضعیف روایات بیان کرنی شروع کر دی ہیں تو ہم اب انہی لوگوں کی بات سنتے ہیں جن سے ہم واقف ہیں۔

سوچنے کا یہی انداز جو ابن عباسؓ کا تھا بعد میں ائمہ محدثین نے بھی اختیار کیا اور ہر روایت کی سند دریافت کرنے لگے۔ مشہور تابعی محدث ابن سیرینؒ کا قول ہے کہ پہلے اسناد معلوم کرنے کا رواج نہ تھا۔ جب فتنہ کا زمانہ آیا تو لوگوں نے راویوں سے پوچھنا شروع کیا کہ رجالِ سند کا نام لو۔ وہ نام لیتا تو جس کو اہلِ سنت میں سے سمجھتے اس کی روایت قبول کر لیتے اور جس کو اہلِ بدعت میں شمار کرتے اس کی روایت کو قبول نہ کرتے۔ اس طرح صحابہ کرام کے درایتِ حدیث کے اسلوب کے بجائے اسناد کے ذریعے روایت کو پرکھنے کا طریقہ رائج ہو گیا اور تدوینِ حدیث کے زمانے میں اسی کا لحاظ رکھتے ہوئے ائمہ نے اپنے مجموعے مرتب کیے۔

خلاصۂ بحث :

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ حدیثِ رسولؐ کے بارے میں نہایت بیدار تھے۔ ان کے لیے سند کا مسئلہ ابھی پیدا نہ ہوا تھا لیکن متنِ حدیث پر وہ برابر غور کرتے اور درایت کے اصولوں پر اس کو پرکھتے۔ راوی اگر ثقہ ہی نہیں بلکہ نہایت جلیل القدر بھی ہوتا جب بھی وہ متنِ حدیث کے اضطراب کی تحقیق کر کے اس کو دور کرتے۔ درایت کے اصولوں میں روایت کے شاہد تلاش کرنا، قرآن مجید اور سنتِ معلومہ سے اس کی مطابقت معلوم کرنا اور اصولی و عقلی بنیادوں پر اس کو جانچنا خاص اہمیت رکھتا تھا۔ خلفائے راشدین نے اپنے سامنے پیش ہونے والی بعض روایات کے حق میں گواہ طلب کیے یا حلف لیا اور روایتِ حدیث کے کام کی سنگینی سے مسلمانوں کو برابر آگاہ رکھا۔ دورِ صحابہ کے بعد روایتِ حدیث میں اسناد کو زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی۔ درایت کے پہلو سے تحقیقِ حدیث میں صحابہ کرام کے طرزِ عمل میں ہمارے لیے آج بھی رہنمائی کا بڑا سامان ہے۔

حکمتِ قرآن
امین احسن اصلاحی

آخرت اور جزا وسزا
فلسفہ اور قرآن کی روشنی میں (۲)

قرآن مجید کا نقطۂ نظر

اصحابِ فکر و فلسفہ کے خیالات میں نے آپ کے سامنے پیش کر دیے۔ ان کے اندر جو خلا تھا اس پر تنقید کر کے اس کو بھی واضح کر دیا ہے۔ اب میں آپ کے سامنے اس باب میں قرآن مجید کا نقطۂ نظر پیش کروں گا:

مضمون کے شروع میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اہل فلسفہ نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے یہ سوال جو اٹھایا ہے کہ انسان کے اندر روح نامی کوئی شے ہے بھی یا نہیں اور ہے تو مرنے کے بعد وہ باقی رہتی ہے یا فنا ہو جاتی ہے؟ ہمارے نزدیک یہ سوال اس بحث سے بالکل غیر متعلق ہے لیکن انہوں نے اسی سوال پر سارے مسئلہ کی بنیاد رکھ دی ہے۔ جن فلسفیوں نے اپنے زعم کے مطابق یہ ثابت کر دیا کہ روح نامی کوئی شے سرے سے انسان کے اندر موجود ہی نہیں ہے یا ہے تو وہ انسان کے مرنے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے، انہوں نے آخرت ہی کی نفی کر دی کہ جب روح کا وجود ہی نہیں تو آخرت کے وجود کے کیا معنی!

اگر یہ حضرات ایک ضمنی سوال پر سر کھپانے کے بجائے مندرجہ ذیل سوالات پر غور کرنے کی زحمت اٹھاتے تو بہتر طور پر فیصلہ کر سکتے کہ آخرت ہے یا نہیں اور اگر نہیں ہے تو اس سے کیا خرابیاں لازم آتی ہیں:

پہلا سوال یہ ہے کہ اگر قیامت اور جزا و سزا نہیں ہے تو کیا اس دنیا کی کوئی عقلی اور اخلاقی توجیہ ممکن ہے؟ کیا اس کے وجود کو جائز اور معقول ثابت کیا جا سکتا ہے؟ کیا اس کا باقی رہنا کسی پہلو سے بھی ایسی چیز ہے کہ جس کو کوئی عاقل گوارا کر سکے اور کوئی حساس آدمی جس میں جینا پسند کرے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا اس کائنات کے خالق کی بدیہی صفات کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ قیامت لازماً آئے؟ اس کے آئے بغیر اس کی صفات کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔ ایک روزِ عدل کے آئے بغیر اس کائنات کے

خالق کو عادل و حکیم مانا جا سکتا نہ اس کو رحمان و رحیم تسلیم کیا جا سکتا۔ کیا العیاذ باللہ وہ ایک کھلنڈرا اور کارِ عبث کرنے والا نہیں سمجھا جائے گا؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ کیا انسان کی فطرت اس بات کا تقاضا نہیں کر رہی ہے کہ آخرت اور جزا و سزا لازماً ظہور میں آئے؟ اگر آخرت نہیں ہے تو اس سے انسان کی فطرت اور اس کائنات کے نظام میں ایسا تضاد واقع ہو گا کہ اس کا رفع کرنا ممکن نہ ہو گا۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ کائنات کی فطرت کچھ اور گواہی دیتی ہے اور انسان کی فطرت کی شہادت کچھ اور ہے۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ اس دنیا میں قوموں کے عزل و نصب کے باب میں اللہ تعالیٰ کے جو سنن اور قوانین جاری ہیں اور جن کا ہم برأی العین مشاہدہ کر رہے ہیں، کیا وہ اس بات کی شہادت نہیں دے رہے ہیں کہ ایک روزِ عدل اور جزا و سزا لازمی طور پر مقدر ہے؟ اس کے بغیر ان کا جواز ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

پانچواں سوال یہ ہے کہ انسان جو منصبِ خلافت پر متمکن ہے (اس خلافت کی نوعیت اور حکمت پر ہم اپنے ایک لیکچر میں مفصل بحث کر چکے ہیں) کیا اس کی خلافت کا یہ لازمی تقاضا نہیں ہے کہ اس منصب کی ذمہ داریوں کی مسئولیت کے لیے ایک روزِ احتساب آئے اور اس میں وہ اپنے اعمال کے موافق جزا یا سزا پائے؟

اگر ان پانچوں سوالوں کا جواب اثبات میں ہو تو پھر یہ بحث بالکل غیر متعلق ہے کہ انسان کے اندر روح نامی کوئی شے ہے یا نہیں اور ہے تو مرنے کے بعد وہ باقی رہتی ہے یا ختم ہو جاتی ہے۔ تب خالق کائنات پر یہ واجب ہو جاتا ہے کہ وہ قیامت ضرور لائے۔ اگر روح بالفرض نہیں ہے تو اس کو بھی پیدا کرے۔ مر چکی ہے تو اس کو زندہ کرے۔ یہاں تک کہ اگر جسم کی بھی ضرورت ہو تو اس کے ذرّے ذرّے کو بھی جمع کر کے اس کو مکمل شکل میں کھڑا کرے اور اس کے ایک ایک عضو سے اس کے اعمال سے متعلق باز پرس کرے۔

اخلاقی جواز کے پہلو سے مسئلہ کا جائزہ:

اب آیئے پہلے اخلاقی جواز کے پہلو سے مسئلہ کا جائزہ لیجیے:

اگر جزا و سزا اور آخرت نہیں ہے، یہ دنیا ایک دن اچانک ختم ہو جاتی ہے یا یوں ہی لاالی نہایہ چلتی رہتی ہے تو اس کے پیدا کرنے کی غایت کیا ہوئی؟ فرض کیجیے کہ دنیا کے پیدا کرنے کی غایت انسان ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے پیدا کیے جانے کا مقصد کیا ہے؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ اس دنیا کی ہر چھوٹی بڑی چیز بالواسطہ یا بلاواسطہ انسان کی خدمت میں لگی ہوئی ہے لیکن انسان اپنے وجود سے شاہد ہے کہ وہ اس دنیا کی کسی چیز کے لیے نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ متعین کرنا ضروری ہے کہ اگر دنیا انسان کے لیے پیدا ہوئی ہے

تو وہ کس کے لیے پیدا ہوا ہے؟ یہ سوال اس وجہ سے اور بھی اہم ہو جاتا ہے کہ انسان کے اندر اگرچہ خیر کا شعور موجود ہے اور اس کے کئی قابل تعریف کارنامے بھی تاریخ میں رقم ہیں لیکن فی الجملہ دنیا میں شر غالب نظر آتا ہے۔ اس دور میں انسان نے سائنس کے میدان میں بڑی ترقی کی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترقی تمام تر اس کی شری صلاحیتوں ہی میں ہوئی ہے۔ خیر کی صلاحیتوں میں نہیں ہوئی۔ چنانچہ اس وقت دنیا میں کہیں امن و امان نہیں ہے، قوم قوم کی دشمن اور آدمی آدمی کا بیری ہے۔ شہر کے اندر سکون ہے نہ دیہات میں ہر جگہ فتنہ و فساد کی قیامت برپا ہے۔ سوچنے کا انداز بالکل تخریبی ہو گیا ہے۔ مجھے تو اس صورت حال پر خواجہ حافظ کے یہ شعر بار بار یاد آتے ہیں ؎

این چہ شوریست کہ در دورِ قمری بینم
ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شری بینم!
اسپِ تازی شدہ مجروح بزیرِ پالاں!
طوقِ زریں ہمہ در گردنِ خری بینم!

دنیا کے بھگوان کی لیلا ہونے کا تصور:

اس صورت حال کی ایک توجیہ تو وہ ہے جو دنیا کی مشرک قوموں نے پیش کی۔ انہوں نے اس کائنات کو اپنے دیوتاؤں کی ایک تماشا گاہ قرار دیا اور ہندو فلسفیوں نے اس کو بھگوان کی لیلا سے تعبیر کیا۔ ان کے ہاں چونکہ قیامت کا کوئی واضح تصور نہیں تھا اس وجہ سے انہوں نے خیال کیا کہ جس طرح دنیا کے بادشاہ اپنی تفریح کے لیے تھیٹر بناتے ہیں، اسی طرح ان کے غیبی دیوتاؤں نے یہ دنیا بنائی ہے اور وہ اس میں کسی کو ظالم اور کسی کو مظلوم، کسی کو قاتل اور کسی کو مقتول بنا کر اس کا تماشا دیکھتے اور اپنا جی بہلاتے ہیں۔ ہمارے اس زمانے کے منکرین و ملاحدہ اگرچہ زبان سے تو یہ بات نہیں کہتے کہ کہنے میں یہ نہایت بھونڈی ہے لیکن جب وہ قیامت اور ایک روزِ عدل و انصاف کو نہیں مانتے تو ان کے دل کے اندر بھی اصلاً یہی تصور باطل گھسا ہوا ہوتا ہے کہ یہ دنیا ایک بازیچۂ اطفال ہے۔ اس کی حکمت اور فلسفے پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں اور کسی سنگین سے سنگین واقعہ پر بھی انسان کو متہم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ تو بس ڈرامے کا ایک ایکٹر ہے۔

دنیا کی تخلیق بے مقصد نہیں:

قرآن مجید نے اس جواب کو بالکل فضول اور مہمل قرار دیا ہے۔ سورہ انبیاء میں ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاۗءَ وَالْاَرْضَ وَمَا

اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان

بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝

ہے کھیل تماشا کے طور پر نہیں بنایا۔ اگر ہم کوئی کھیل بنانا ہی چاہتے تو خاص اپنے پاس سے ہی بنا لیتے، اگر ہم یہ کرنے والے ہوتے۔

(الانبیاء – ۱۶ : ۱۷)

یعنی آسمان، زمین اور پوری کائنات کا اہتمام و انصرام اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ یہ بازیچۂ اطفال یا کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہے۔ اس دنیا کے خالق کی طرف کھیل اور کارِ عبث کی نسبت بالکل خلاف عقل ہے۔ یہاں کی ہر چیز عظیم غایت و مقصد کے ساتھ پیدا کی گئی ہے۔ اگر خالقِ کائنات کوئی کھیل بنانے والا ہوتا تو اپنے پاس سے اس کا سر و سامان مہیا کر لیتا، اس میں اپنے بندوں اور دوسری مخلوقات کو کیوں گھسیٹتا؟ روم کے قدیم سلاطین اپنے تھیٹروں میں بھوکے شیروں اور اپنے مظلوم غلاموں کی چیر پھاڑ کا تماشا دیکھتے تھے۔ اگر دنیا کا کوئی مقصد نہیں تو العیاذ باللہ یہی رائے اس کائنات کے خالق کے متعلق بھی قائم کرنی پڑے گی۔ اگر اس نے دنیا کے لیے ایک روزِ عدل نہیں بنایا تو پھر اس نے دنیا کو آدم و ابلیس، حق و باطل، ہدایت و ضلالت، عدل و ظلم، خیر و شر اور ظالم و مظلوم کی ایک رزم گاہ کیوں بنا دیا ہے۔ خالق کا اپنی مخلوقات کے ساتھ جو تعلق ہے وہ اس بات کو واجب کرتا ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں حق و باطل کا فیصلہ ہو، حق سربلند ہو اور باطل نابود۔ اس کے بغیر اس کائنات کی کوئی ایسی توجیہ ممکن نہیں ہے جو اس کو حق و عدل پر مبنی قرار دے سکے۔

دوسری جگہ فرمایا:

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى

ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو نہیں پیدا کیا مگر ایک غایت اور معین مدت کے لیے۔

(الاحقاف : ۳)

یعنی اس کارخانۂ کائنات پر جو شخص بھی غور کرے گا، اس کو یہ حقیقت نمایاں طور پر نظر آئے گی کہ یہ کسی کباڑیے کا گودام نہیں ہے بلکہ اس کے ہر گوشہ میں اس کے خالق کی عظیم قدرت نمایاں ہے۔ اس کے اندر نہایت اعلیٰ اہتمام ہے، بے نظیر ترتیب و انتظام ہے، بے مثال اقلیدس و ریاضی ہے۔ سورج معین نظامِ اوقات کے ساتھ نکلتا اور اپنی تابانیوں سے سارے جہان کو روشن کرتا ہے، اس کے فیض سے سردی، گرمی، خزاں اور بہار کے مختلف موسم پیدا ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک ہماری دنیا کی زندگی اور اس کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ چاند اس سے کسبِ نور کر کے معین منزلیں طے کرتا اور ہماری تاریک راتوں میں مختلف زاویوں سے ہمارے لیے شمع برداری بھی کرتا ہے اور ہمارے مہینوں اور سالوں کی تقویم بھی بناتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ دنیا خیر و شر اور نیکی و بدی کے درمیان امتیاز

کے بغیر یوں ہی چلتی رہے گی یا یوں ہی ختم ہوجائے گی اگر یہ مان لیا جائے تو یہ ساری قدرت و حکمت، جو اس کائنات کے ہر گوشہ میں جلوہ گر ہے، بے مقصد و بے غایت ہو جاتی ہے۔ کچھ اینٹیں ایک جگہ بکھری ہوئی پڑی ہوں تو ان کو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ یونہی پڑی ہوئی ہیں لیکن یہی بات اگر کوئی شخص تاج محل، لال قلعہ یا بادشاہی مسجد کے متعلق کرے تو کیا کوئی سلیم العقل اور مستقیم الفطرت انسان ایک لمحہ کے لیے بھی اس کو باور کرسکتا ہے! پس اس کائنات کے اہتمام و انصرام کا یہ تقاضا ہے کہ مانا جائے کہ نہ اس کا ظہور کوئی اتفاقی حادثہ ہے نہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے بلکہ یہ نہایت اہتمام سے پیدا کیا ہوا ایک باغایت و بامقصد کارخانہ ہے اور اس کی مقصدیت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان کو اس میں یونہی ایک شتر بے مہار نہ چھوڑ دیا جائے بلکہ اس کے سامنے ایک ایسا دن آئے جس میں وہ لوگ پورے انصاف کے ساتھ اپنے اعمال کا صلہ پائیں جنھوں نے خالق کائنات کی پسند کے مطابق زندگی بسر کی اور وہ لوگ اپنے جرائم کی سزا بھگتیں جنھوں نے اس دنیا کو کھیل تماشا سمجھا اور ساری زندگی بطالت میں گزار دی۔

انسان مقصودِ بالذات نہیں:

دنیا جو حق و باطل کی رزم گاہ بنی ہوئی ہے تو اس صورت حال کی دوسری توجیہ نئے فلسفی یوں کرتے ہیں کہ انسان خود مقصود بالذات ہے۔ وہ ITSELF IN END یعنی خود اپنی ذات میں مطلوب ہے۔ یہ کسی کے لیے نہیں پیدا ہوا ہے بلکہ یہ خود اپنی شریعت کا مصنف، اپنی تہذیب و ثقافت کا موجد اور اپنے قانون کا بانی ہے۔ اس نے جن چیزوں کو برا کہہ دیا ہے وہ بری ہیں۔ اگر کل وہ انھی کو اچھا کہہ دے تو وہی اچھی ہوجائیں گی۔

نئے فلسفیوں کی یہ توجیہ درست نہیں ہوسکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان ہر چیز کا انکار کرسکتا ہے لیکن اس بات کا انکار نہیں کرسکتا کہ وہ مخلوق ہے۔ جب وہ مخلوق ہے تو بہرحال وہ اپنے خالق کی مرضی اور اس کے حکم کے تابع ہے۔ اس کے اقتدار اعلیٰ سے انسان کے لیے کوئی مفر نہیں۔ لہٰذا انسان کسی طرح مقصود بالذات نہیں ہو سکتا۔ مقصودِ بالذات صرف خدا ہو سکتا ہے کیونکہ وہ ہر چیز کا خالق اور قائم بالذات ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں بلکہ سب اس کے محتاج ہیں۔ انسان اس کائنات کا گلِ سرسبد ہے تو لازماً یہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔

چنانچہ فرمایا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ
مَا اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَا
اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ۞ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ
الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ۞
(ذاریات - ۵۶ : ۵۸)

میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری بندگی کریں۔ نہ میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ رزق کا سامان کریں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔ بالتحقیق اللہ ہی روزی رساں، زورآور اور قوت والا ہے۔

گویا اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی کسی احتیاج کے لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ ہر حال میں ان کی ناز برداری کرتا رہے۔ اس کی سلطنت اپنے بل بوتے پر قائم ہے۔ اس نے ان کو اس لیے پیدا کیا کہ اس کی عبادت و اطاعت کا حق ادا کر کے سعادت و کمال کی معراج حاصل کریں۔ اگرچہ انسان کی تخلیق کا یہ مقصد متعین ہو چکا ہے لیکن ہمیں اس دنیا میں کوئی ایسا انتظام نظر نہیں آتا جس میں خدا یہ جانچ کرتا ہو کہ کس شخص نے اپنے مقصد تخلیق کو پورا کیا اور کس نے اس سے بے پروائی برتی۔ اس دنیا میں تو وہ لوگ بھی پوری طرح آزاد ہیں جو خدا کی بندگی و اطاعت کے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں، بلکہ وہ دوسروں کی نسبت زیادہ آزادی کے ساتھ پھلتے پھولتے نظر آتے ہیں۔ لہٰذا قیامت کا آنا ضروری ہے تاکہ اس دن اللہ تعالیٰ یہ دیکھے کہ کس بندے نے اس کی اطاعت میں زندگی گزاری اور کس نے اس کی نافرمانی کی اور ان کی اطاعت یا نافرمانی کے لیے جزا اور سزا کا اہتمام کرے۔

خدا کی بدیہی صفات کا تقاضا:

اب دوسرے سوال پر غور کیجیے کہ خدا کی بدیہی صفات کا تقاضا کیا ہے۔ بدیہی صفات سے میری مراد قدرت، ربوبیت، رحمت، علم اور حکمت کی صفات ہیں جن کا مظہر اس کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز ہے۔

قرآن مجید نے اپنی پہلی ہی سورہ الفاتحہ کا آغاز جن آیات سے کیا ہے ان میں اللہ تعالیٰ کی صفات رحمت و ربوبیت کا حوالہ دے کر روز جزا و سزا کے تصور تک پہنچا دیا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ
الرَّحِيْمِ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۞
(الفاتحہ - ۱ : ۳)

شکر حقیقی کا سزاوار اللہ ہے۔ کائنات کا رب، رحمان اور رحیم، جزا و سزا کے دن کا مالک۔

قرآن مجید نے زمین و آسمان کی خلقت پر غور کرنے والوں کی یہ صفت بیان کی ہے کہ وہ خود بخود اس نتیجہ تک پہنچ جاتے ہیں کہ یہ عظیم کارخانہ بے غایت و بے مقصد نہیں ہو سکتا۔ لازم ہے کہ یہ یونہی تمام نہ ہوجائے بلکہ ایک ایسا دن ضرور آئے جس میں نیکوکار اور گنہگار اپنے اپنے اعمال کا بدلہ پائیں اور دنیا کی خلقت میں پوشیدہ حکمت ظاہر ہو۔ لہٰذا وہ عذاب سے پناہ مانگتے اور دعا کرتے ہیں کہ

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا
سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ
(آل عمران - ۱۹۱)

اے پروردگار تو نے یہ کارخانہ بے مقصد نہیں پیدا کیا، تو اس سے پاک ہے کہ کوئی عبث کام کرے سو تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔

ربوبیت کا تقاضا:

سورۃ النبا میں کائنات کی ان نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو خالق کی صفات کو ثابت کرتی ہیں اور پھر ان صفات کا تقاضا بتایا ہے۔ فرمایا:

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا وَّ خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا وَّ جَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا وَّ بَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّ نَبَاتًا وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا

(النبا ۶-۱۷)

کیا ہم نے زمین کو گہوارہ اور پہاڑوں کو میخیں نہیں بنایا؟ تم کو جوڑے جوڑے نہیں پیدا کیا؟ تمہاری نیند کو دافعِ کلفت نہیں بنایا؟ رات کو تمہارے لیے پردہ اور دن کو وقتِ معاش نہیں بنایا؟ تمہارے اوپر سات محکم آسمان نہیں بنائے؟ ایک روشن چراغ نہیں رکھا؟ کیا ہم نے پانی سے لبریز بدلیوں سے موسلا دھار پانی نہیں برسایا کہ اس سے اگائیں غلہ اور نباتات اور گھنے باغ؟ بے شک فیصلہ کا دن مقرر ہے۔

ان آیات میں کائنات کے ان آثار کی طرف توجہ دلائی ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفات قدرت و حکمت اور رحمت و ربوبیت کی گواہی دے رہے ہیں۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو انسان کے لیے ایک گہوارے کی طرح قرار و سکون کی جگہ بنایا۔ اس میں پہاڑوں کی میخیں ٹھونکی ہیں تاکہ زمین متزلزل نہ ہونے پائے۔ اس نے آدمی کی جنس ہی سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ وہ انسان کے لیے طمانیت اور سکینت کا ذریعہ بنے۔ اس جوڑے کے دونوں فرد آپس میں گہری وابستگی رکھتے ہیں، کوئی ان میں سے تنہا اپنے مقصدِ تخلیق کو پورا نہیں کر سکتا۔ ان میں بظاہر ضدین کی نسبت ہے لیکن خدا نے ان کے اندر ایسے ظاہری اور باطنی داعیات رکھے ہیں کہ وہ باہم مل کر رہنے میں سکون و راحت پاتے اور ایک برتر مقصد کو پورا کرتے ہیں۔ خدا نے انسان کو نیند کی نعمت عطا کی جو دافعِ کلفت ہے، یہ حرکت و عمل کے تسلسل کو منقطع کر کے راحت و سکون کا موقع فراہم کرتی ہے جس سے قویٰ تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ خدا نے اس کے لیے شب کی چادر مہیا کی اور دن کو حصولِ معاش کی سرگرمیوں کے لیے موزوں بنایا۔ زمین کی نشانیوں کے بعد آسمان کی طرف توجہ دلائی کہ اس ناپیدا کنار چھت کو جہاں تک دیکھو گے اس کو محکم پاؤ گے اور اس میں کسی ادنیٰ نقص کی نشاندہی بھی نہیں کر سکو گے۔ اس میں سورج ہے جو اس دنیا میں روشنی، حرارت اور قوت کا ذریعہ ہے۔ یہ نہ ہو تو سارا عالم

تیرہ و تار ہو جائے۔ آسمان سے بارش برستی ہے تو اس سے تمہارے لیے غلے اور مویشیوں کے لیے گھاس اور سبزے اگتے ہیں اور مزید براں گھنے باغ پیدا ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت و ربوبیت کے ان آثار سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جو شخص ان پر غور کرے گا اور اس میں بصیرت ہوگی وہ لازماً پکار اٹھے گا کہ یہ کارخانہ بے غایت و بے مقصد نہیں ہو سکتا۔ آسمان سے لے کر زمین تک یہ انتظامِ پرورش صاف گواہی دے رہا ہے کہ جس پروردگار نے یہ سب کچھ کیا ہے وہ انسان کو غیر مسئول نہیں چھوڑے گا۔ وہ اس کو پیدا کر کے دنیا کے خیر و شر سے بے تعلق ہو کر نہیں بیٹھ رہا ہے بلکہ اس نے ایک فیصلہ کا دن مقرر کر رکھا ہے جس میں وہ سب کو جمع کر کے فیصلہ کرے گا کہ کس نے اس کی ربوبیت کا حق پہچانا اور کس نے اس کی ناقدری کی۔ پھر ان کو انعام دے گا جنہوں نے اس کی نعمتوں کو صحیح استعمال کیا اور ان سے انتقام لے گا جنہوں نے ان کو طغیان و فساد کا ذریعہ بنایا۔ یہ مسئولیت اور جزا و سزا خدا کی ربوبیت کا لازمی تقاضا ہے۔

رحمت کا تقاضا:

قرآن نے قیامت کو اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کا تقاضا بھی بتایا ہے۔ فرمایا:

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ۔

(الانعام-۱۲)

اس نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے۔ وہ تم کو جمع کر کے ضرور لے جائے گا قیامت کے دن کی طرف جس میں ذرا شبہ نہیں۔

یعنی دنیا میں مظلوم پر جو ظلم کیا گیا اگر اس کی دادرسی نہ ہو، ظالم کو اس کے ظلم کی سزا نہ ملے، بدمعاشوں کو کیفرِ کردار تک نہ پہنچایا جائے تو خالق کے متعلق اچھی رائے قائم نہیں ہوتی۔ اس کا رحمان و رحیم ہونا اسی صورت میں ثابت ہوگا جب اس کی رحمت کامل طور پر ظاہر ہو۔ وہ ہر عمل کا پورا پورا بدلہ دے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ خالق کو نیکی و بدی میں کوئی امتیاز نہیں، بلکہ وہ بدی کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ اسی لیے اس نے شریروں کو سارے وسائل دے کر آزاد چھوڑ رکھا ہے کہ وہ اس میں جو ادھم چاہیں مچائیں۔

اس مضمون کو قرآن نے منفی انداز سے بھی پیش کیا ہے۔ فرمایا:

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ؟ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ

(القلم - ۳۵ - ۳۶)

کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کے برابر کر دیں گے؟ تمہیں کیا ہوا ہے تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟

یہاں بانداز تعجب یہ سوال کیا ہے کہ کیا اس دنیا کے خالق کے نزدیک نیکوکار اور بدکار، بے ایمان اور ایمان دار

دونوں یکساں ہو جائیں گے! اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ تم خالق کو عدل اور رحم کی صفات سے عاری سمجھتے ہو۔ قرآن کے اس اندازِ سوال سے یہ بات صاف عیاں ہے کہ انسان کی عام عقل اور عام فطرت اس نقطۂ نظر کو قبول کرنے سے ابا کرتی ہے۔ اگر کچھ لوگ ایسا سوچتے ہیں تو یہ چیز دو شکلوں سے خالی نہیں۔ یا وہ اپنی خواہشوں سے بے بس ہو کر اپنی عقل کی آنکھوں میں دھول جھونکتے اور اپنی فطرت کو جھٹلاتے ہیں یا انہوں نے اپنی یہ دونوں صلاحیتیں برباد کر لی ہیں۔

فطرت انسانی کا تقاضا:

اب تیسرے سوال پر غور کیجیے کہ کیا انسان کی فطرت اس بات کا تقاضا کرتی ہے یا نہیں کہ آخرت اور جزا و سزا ضرور ہونی چاہیے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی حقیقت تو یہ جاننی چاہیے کہ ہماری فطرت چاہتی ہے کہ جس درجہ کی مراعات ہمیں حاصل ہوں اسی درجہ کی ذمہ داری کے لیے ہم مسئول ہوتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ مراعات سے تو ہم متمتع ہوں لیکن ان کے عوض میں ہمارے اوپر کوئی ذمہ داری نہ ہو۔ اوپر ہم نے دیکھا کہ رب رحمان رحیم کی ربوبیت آسمان سے زمین تک کی ہر چیز سے ہویدا ہے اور ہم بغیر کسی استحقاق کے اس سے متمتع ہو رہے ہیں۔ جس خدا نے پرورش کا یہ اہتمام فرمایا ہے کہ اپنے آسمان و زمین اور اپنے ابر و ہوا سب کو انسان کی خدمت میں لگا رکھا ہے کیا وہ اس کو اپنے باغوں اور چمنوں میں عیش کرنے کے لیے اسی طرح چھوڑے رکھے گا، کوئی ایسا دن نہ لائے گا جس میں وہ دیکھے کہ کس نے اس کی نعمتوں کا حق پہچانا۔ ہر نعمت کا یہ حق ہے کہ اس کا شکر ادا کیا جائے اور ہر نعمت کے ساتھ مسئولیت کا شعور انسان کی فطرت میں ہے۔ اس شعور سے عاری وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنی فطرت کو بالکل مسخ کر لیتے ہیں۔

اس سلسلہ کی دوسری حقیقت یہ ہے کہ انسان کے اندر فاطرِ فطرت نے عدل اور ظلم کے درمیان امتیاز کے لیے ایک کسوٹی بھی رکھی ہے اور عدل کے ساتھ محبت اور ظلم سے نفرت بھی ودیعت فرمائی ہے۔ اس کے باوجود انسان ظلم کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ عدل و ظلم میں امتیاز کرنے سے قاصر ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنی کسی خواہش یا جذبے سے مغلوب ہو کر اپنے نفس کے توازن کو قائم نہیں رکھ پاتا۔ ایک چور جو دوسروں کے گھر میں نقب لگاتا ہے وہ ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ کوئی دوسرا اس کے گھر میں نقب لگائے۔ ایک قاتل یہ نہیں پسند کرتا کہ کوئی اس کی یا اس کے کسی عزیز و اقارب کی جان کے درپے ہو۔ انہی چوروں، قاتلوں اور دوسرے برے لوگوں کی غیر جانبدارانہ رائے معلوم کیجیے تو وہ اس حقیقت کا اعتراف کریں گے کہ عزت و احترام نیکی ہی کے لیے ہونا چاہیے اور یہ کہ ان کا عمل اس کے خلاف ہے۔

انسان کا یہ طرزِ عمل اور اس کی فطرت کا یہ پہلو اس بات کی بدیہی شہادت ہے کہ نہ وہ نیک اور بد کو یکساں سمجھتا اور نہ اس بات پر راضی ہے کہ دونوں قسم کے لوگوں سے ایک ہی طرح کا معاملہ کیا جائے بلکہ اس کا غیر جانبدارانہ فیصلہ یہی ہے کہ دونوں کے ساتھ الگ الگ معاملہ ہونا چاہیے۔ یہ چیز اس بات کو مستلزم ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسا دن لائے جس میں نیکوں اور بدوں کے ساتھ ان کے اعمال کے مطابق معاملہ کرے۔ گویا انسان کی فطرت کا یہ پہلو روزِ جزا و سزا کے لازمی ہونے پر دلیل ہے۔

تیسری اہم حقیقت جو قرآن مجید کی سورہ قیامہ میں خاص اہتمام کے ساتھ واضح فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ایک نفس لوّامہ ودیعت فرمایا ہے جو اس بات کی نہایت واضح شہادت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ اس مجموعی کائنات کے لیے اس نے جو روزِ قیامت مقرر کر رکھا ہے اس کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہر انسان کے سینے میں رکھ دے جو اس کو برابر اس حقیقت کی یاد دہانی کرتا رہے کہ جس خدا نے اس کو وجود بخشا ہے وہ اس کی نیکی اور بدی سے بے تعلق نہیں ہے۔

نفس لوّامہ انسان کی فطرت کے اندر ایک عدالت ہے جب وہ کسی بدی کا ارتکاب کرتا ہے تو یہ اس کو ملامت اور سرزنش کرتا ہے اور جب وہ کوئی نیکی کرتا ہے تو یہ اس کی تحسین کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب انسان خود اپنے ضمیر کے اندر ایک نگران رکھتا ہے جو اس سے صادر ہونے والی برائیوں پر اس کو ٹوکتا رہتا ہے تو اس کے لیے یہ تصور کرنا کس طرح معقول قرار دیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک شترِ بے مہار ہے، جس طرح کی زندگی وہ چاہے بسر کرے اور جس قدر چاہے اس نگران کی مخالفت کرے لیکن کوئی اس سے بازپرس کا حق نہیں رکھتا۔ اگر انسان شترِ بے مہار ہے تو یہ نفسِ لوّامہ اس کے اندر کہاں سے آ گھسا؟ اگر اس کا خالق لوگوں کی نیکی اور بدی دونوں سے بے تعلق ہے تو اس نے نیکی کی تحسین اور بدی پر سرزنش کے لیے انسان کے اندر یہ خلش کیوں اور کہاں سے ڈال دی؟ پھر یہیں سے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب اس نے ہر انسان کے اندر یہ چھوٹی سی عدالت قائم کر رکھی ہے تو اس پورے عالم کے لیے وہ ایک ایسی عدالت کبریٰ کیوں نہ قائم کرے گا جو سارے عالم کے اعمالِ خیر و شر کا احتساب کرے اور ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا دے؟ ان سوالوں پر خواہشوں سے آزاد ہو کر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ہر انسان کے دل میں قیامت کے نمونے اسی لیے نصب کر دیے گئے ہیں کہ وہ اس کو یاد دہانی کراتے رہیں کہ یہ عظیم دن آنے والا ہے۔ نیز جو شخص برائی کا ارتکاب کرتا ہے وہ کہیں پس پردہ نہیں کرتا بلکہ خدا کی عدالت کے دروازہ پر اس کے مقرر کیے ہوئے کوتوال کے روبرو کرتا ہے۔ یہی حقیقت حکماء اور عارفین نے یوں سمجھائی ہے کہ انسان ایک عالم اصغر ہے جس کے اندر اس عالم اکبر کا پورا عکس موجود ہے۔ اگر انسان اپنے کو صحیح طور پر پہچان لے تو وہ خدا اور آخرت سب کو پہچان لیتا ہے۔ پس انسان کی فطرت کا مطالبہ ہے کہ قیامت واقع ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہی بات ہوگی کہ من چہ می سرایم و

طنبورہ من چہ می سراید۔

خدا کے قوانین وسنن کا تقاضا:

اب ان سننِ الٰہیہ کا جائزہ لیجیے جو قومی و اجتماعی معاملات میں ظاہر ہوئی ہیں۔ قرآن مجید نے دنیا کی متعدد قوموں کے واقعات بیان کیے ہیں جن میں قوم نوح، عاد، ثمود، قوم لوط، اہل مدین اور قوم فرعون سرفہرست ہیں۔ یہ قومیں اپنی عسکری قوت اور تہذیبی وتمدنی صلاحیتوں کے لحاظ سے بہت بلند تھیں لیکن طرح طرح کی اخلاقی وروحانی بیماریوں میں مبتلا ہوگئیں۔ جب اخلاقی زوال کے نتیجہ میں ان کا اجتماعی کردار برباد ہوگیا تو خداوند تعالیٰ نے ان کی موعظت کے لیے رسول بھیجے لیکن یہ قومیں اپنے طغیان وتمرد سے باز نہیں آئیں۔ انہوں نے اپنی آنکھیں اس طرح بند کرلیں کہ وہ رسولوں کی پیش کردہ کسی بھی نشانی سے نہ کھلیں۔ اللہ تعالیٰ قوموں کے اجتماعی کردار سے بے تعلق نہیں رہتا بلکہ وہ برابر گھات لگائے ان کی نگرانی کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنی حکمت کے تحت ان کو ایک خاص حد تک مہلت دیتا ہے کہ وہ اپنی اصلاح کرلیں اگر اصلاح کرنا چاہیں ورنہ اپنا پیمانہ بھرلیں۔ جب وہ اپنا پیمانہ بھرلیتی ہیں تو خدا ان کو اس طرح پکڑتا ہے کہ ان کی ہستی کو مٹا کر رکھ دیتا ہے۔ چنانچہ ان تمام اقوام کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔ اس سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ اس کائنات کا مالک دنیا کے خیر وشر سے بے تعلق نہیں۔ چنانچہ جب کسی قوم کا طغیان حد سے متجاوز ہوجاتا ہے تو وہ لازماً اس کے قانونِ مکافات سے دوچار ہوتی ہے۔

رسولوں کے معاملہ میں تو یہ حقیقت بالکل واضح ہے لیکن دوسری قوموں کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے یہ اتنا واضح نہیں۔ البتہ قرآن مجید نے سورہ روم میں رومیوں اور ایرانیوں کی آویزش کے حوالے سے یہ بتایا ہے کہ قوموں کی زندگی میں بڑے بڑے انقلابات محض اتفاقاتِ زمانہ اور گردشِ روزگار سے نہیں پیش آتے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے پیش آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ہر حکم عدل وحکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ رومیوں نے جب اپنے اندر وہ خرابیاں پیدا کرلیں جو کسی قوم کو خدا کے تازیانۂ تنبیہ کا مستحق بناتی ہیں تو وہ اس بنا پر نہیں بچ سکتے تھے کہ وہ اچھے عقائد ورسوم رکھتے تھے۔ صرف عقائد ورسوم اجتماعی زندگی کے بنانے اور بگاڑنے میں اصل عامل نہیں ہوتے بلکہ اصل عامل وہ انفرادی اور اجتماعی کردار ہوتا ہے جو صحیح عقائد ورسوم سے پیدا ہونا چاہیے۔ رومیوں کا کھوکھلا کردار مجوسیوں کے ہاتھوں ان کی شکست کا باعث بنا۔ پس دنیا میں قوموں کا عزل ونصب اتفاقی نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی کسوٹی پر جانچ کر جس قوم کو اہل پاتا ہے اس کو عروج عطا کرتا ہے اور جب وہ اخلاقی عناصر سے خالی ہوجاتی ہے تو اس کو فنا کرکے ایسی قوم کو لاتا ہے جو کردار میں اس سے بہتر ہوتی ہے۔ یہاں بھی خدا کا قانون مکافات ہی حرکت میں ہوتا ہے۔

ایک قوم کے ساتھ جو معاملہ ہوتا ہے۔ اس میں افراد اپنی انفرادی حیثیت سے زیر بحث نہیں آتے۔ یہ معاملہ

قوم سے من حیث القوم ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ قوم میں کچھ لوگ نیک بھی رہے ہوں لیکن جب قوم فنا ہوتی ہے تو وہ بھی بے آبرو ہوجاتے ہیں لیکن ان کی نیکی کا صلہ تو ملنا چاہیے۔ اسی طرح ایک قوم اپنی نیکیوں کی بدولت عروج پاتی ہے لیکن اس کے اندر برے افراد بھی تو ہوتے ہیں۔ ان کو سزا ملنا عدل کا تقاضا ہے۔ اس لیے افراد کا معاملہ اور قوم کا معاملہ ایک ساتھ طے نہیں ہوسکتا۔ افراد کے محاسبہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ تمام اولین وآخرین، تمام صغیر وکبیر اور زمین وآسمان سب کے سب جمع ہوں اور ان کی شہادت کے مطابق اللہ تعالیٰ ہر فرد کے بارے میں فیصلہ فرمائے اور اگر وہ اجر کا مستحق ہو تو اس کو اجر دے اور اگر اس کے اعمال سزا کے متقاضی ہوں تو اس کو سزا دے۔ پس قیامت کا واقع ہونا قانونِ مکافات کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کو نہایت عمدہ طریقے سے سورہ التین میں واضح فرمایا ہے۔

انسان کے خلیفہ ہونے کا تقاضا:

انسان کو اللہ تعالیٰ نے عقل، ادراک اور علم کی جن صلاحیتوں سے آراستہ فرمایا ہے اور جن فطری قوتوں اور صلاحیتوں سے اس کو مسلح کیا ہے، ان کی روشنی میں یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ انسان زمین کے دوسرے جانداروں کی طرح اس زمین ہی کی مخلوق نہیں ہے بلکہ اس کا مرتبہ بہت بلند ہے اور خدا نے اس کو خلیفہ کا منصب عطا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو ذات خود ہر جگہ حاضر وناظر ہو، جو ہر قسم کے تصرف پر خود پوری پوری قدرت رکھتی ہو، جو کسی کی مدد واعانت کی محتاج نہ ہو، جس کو ایک پل کے لیے بھی اپنی مملکت کے امور ومعاملات سے دستکش یا غیر حاضر ہونے کی ضرورت پیش نہ آتی ہو، اس کی طرف سے کسی کو خلیفہ بنانے کے معنی اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتے کہ وہ اپنے خلیفہ کو کچھ اختیارات دے کر یہ امتحان کرنا چاہتی ہے کہ یہ ان اختیارات کو کس طرح استعمال کرتا ہے۔ خلیفہ کے مطلق العنان اور غیر مسئول ہونے کا تصور بنیادی طور پر غلط ہے۔ کوئی صاحبِ قدرت اور علیم وخبیر اپنے خلیفہ کو شترِ بے مہار بنا کر نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ لازماً اس کی ایک ایک خیانت پر اس سے مواخذہ بھی کرے گا اور اگر اس نے اپنے فرائض صحیح طور پر انجام دیے ہوں گے تو اس کو اس کی خدمات کا بھرپور صلہ بھی دے گا۔ گویا جزا وسزا انسان کے مرتبۂ خلافت پر سرفرازی کا ایک لازمی اور بدیہی تقاضا ہے۔

اس حقیقت کو سیدنا مسیح علیہ السلام نے نہایت خوب صورت تمثیل سے واضح فرمایا ہے کہ ایک آدمی کے دو باغ تھے۔ اس نے اپنے غلاموں کے دو گروہوں کو الگ الگ ان کی نگرانی کا کام سونپا۔ ایک گروہ نے اپنے زیر نگرانی باغ کو آباد کیا، اس کو سیراب کیا اور اس پر خوب محنت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باغ خوب پھل لایا جو ان غلاموں نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ ٹوکروں میں سجا کر اپنے مالک کو پیش کیا۔ دوسرے باغ کے نگران غلاموں نے باغ

پرچنداں توجہ نہ دی۔ اس کے پھل بیچ دیے، اس کی لکڑیاں جلا دیں اور تمام باغ کو ویران کرکے رکھ دیا۔ سیدنا مسیحؑ نے فرمایا کہ کیا آقا جب فارغ ہوگا تو دونوں غلاموں کے ساتھ ایک ہی طرح کا معاملہ کرے گا؟ یقیناً نہیں بلکہ جن غلاموں نے اپنی ذمہ داری خوبی سے نبھائی تھی ان کو انعام دے گا اور عزت بخشے گا۔ یہ تمثیل انسان کی خلافت کے تقاضا ہی کی وضاحت کرتی ہے۔

ایک روزِ انصاف کیوں ضروری ہے :

ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ بات تو معقول ہے کہ ہر شخص اپنی نیکی یا بدی کی جزا یا سزا پائے لیکن اس کے لیے یہ کیا ضروری ہے کہ پوری دنیا ایک معین مدت کے بعد ختم ہوجائے۔ یہ کیوں ممکن نہیں کہ دنیا برابر قائم بھی رہے اور جو مرتے جائیں ان کی عدالت بھی ہوتی رہے؟ دراصل معاملہ یوں ہے کہ انسان کا ہر عمل خواہ وہ نیکی کا عمل ہو یا بدی کا اپنے اندر متعدی ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایک شخص نیکی کا تخم بوتا ہے جس کی برکت سے صدیوں اور قرنوں تک اولادِ آدم مستفید ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک شخص ایک غلط اور گمراہ کن فلسفہ ایجاد کرتا ہے جس کی ضلالت ایک خلقِ کثیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور وہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اتنی مستحکم ہوتی جاتی ہے کہ اس کو اکھاڑنا تو درکنار، قوموں کے بعد قومیں اٹھتی ہیں اور اپنی صلاحیتیں اس کو پروان چڑھانے پر صرف کرتی ہیں۔ اس صورت حال کے سبب سے کسی نیکی یا بدی کے اثرات کا صحیح اندازہ اس شخص کو کرانا ہو تو یہ ضروری ہوگا کہ اس کے عمل کے بعید سے بعید اثرات اس کے سامنے لائے جائیں اور عناصر کائنات میں سے جو بھی اس کی نیکی یا بدی کے گواہ ہوں ان کو بھی پیش کیا جائے اس کے بغیر کامل عدل ظہور میں نہیں آسکتا۔ اس وجہ سے یہ ضروری ہے کہ خالقِ کائنات اس کائنات کی بساط ایک دن لپیٹ دے اور تمام انسانوں کا روزِ انصاف ایک ہی ہو۔

میں نے اس بات کی وضاحت کردی کہ قرآن مجید نے آخرت کو کن بنیادوں پر مبنی کیا ہے اور اس کا فلسفہ کیا ہے۔ دنیا ہماری زندگی کا ایک حصہ ہے جو ہمیں نظر آتا ہے۔ اس کا بڑا حصہ آخرت پردے میں ہے۔ محض سامنے کے حصے کو پیش نظر رکھ کر اس کائنات کی صحیح توجیہ کوئی بڑے سے بڑا فلسفی بھی نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ چونکہ دونوں جہانوں کا علم رکھتا ہے اس لیے اس نے دنیا اور آخرت کی چول سے چول ملا کر دکھا دیا ہے کہ یہ دنیا جب آخرت کے ساتھ ملتی ہے تب وہ ایک حسین وحدت بنتی ہے اور تب یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی یہ دنیا ایک عادل، رحیم، کریم، مدبر اور حکیم کا بنایا ہوا ایک بامقصد کارخانہ ہے۔

(ترتیب : محبوب سبحانی)

امین احسن اصلاحی

آدمی کا تعلق معاشرہ سے

آدمی ایک اثر پذیر ہستی ہے اور یہ اثر پذیری اس کی ایک نہایت اعلیٰ صفت ہے۔ اس کے فیض سے وہ اپنے بڑوں کے طور طریقے اور ان کے آداب و افکار اپناتا ہے اور پھر ان کو اپنے بعد والوں کی طرف منتقل کرنے والا بنتا ہے۔ یہ نہ ہو تو آدمی ایک پتھر بن کر رہ جائے، نہ پچھلوں سے کچھ لینے والا بن سکے نہ اگلوں کو کچھ دینے والا۔ لیکن اس خوبی کا ایک خطرناک پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ اس کی بدولت وہ جس طرح دوسروں کے اچھے عادات و اطوار کی چھاپ قبول کرلیتا ہے اسی طرح ان کی بُری روایات اور ان کے بُرے آثار کے نقوش بھی قبول کرلیتا ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو نہایت خطرناک ہے۔ اس کے سبب سے اس کا پورا اندوختہ، اگر وہ اس کی برابر چھان پھٹک نہ کرتا رہے، رطب و یابس کا ایک انبار بن کے رہ جاتا ہے۔ بچپن میں تو اس چھان پھٹک کی صلاحیت نہیں ہوتی اس وجہ سے وہ ماں باپ کے ڈالے ہوئے ہر اثر کو قبول کرتا چلا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے: ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ وینصرانہ و یمجسانہ[1] (ہر بچہ پیدا تو ہوتا ہے فطرتِ اسلام پر، لیکن اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں)۔ لیکن سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد آدمی کے عقلی ہستی ہونے کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ وہ اس سارے ذخیرہ کو جو اس کو آباء و اجداد سے ملا ہے جائزہ لے کر دیکھے کہ اس میں کتنا حق ہے، کتنا باطل۔ اگرچہ باپ دادا کے طریقہ سے آدمی کو نہایت گہرا اُنس ہوتا ہے، اس کو وہ آسانی سے چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر عاقل و بالغ کے لیے یہ امتحان رکھا ہے کہ وہ مجرد اس وجہ سے کسی

[1] صحیح مسلم، کتاب القدر، باب معنی کل مولود یولد علی الفطرۃ

طریقہ پر جما نہ رہے کہ وہ اس کے باپ دادا سے چلا آ رہا ہے، بلکہ اس کو اپنی عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھے کہ وہ۔ اس کو قبول کرتی ہے یا نہیں اور اس کے باپ دادا ہدایت پر تھے یا گمراہی پر۔ قرآن میں ارشاد ہے :

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ۝

اور جب ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ خدا کی اُتاری ہوئی چیز کی پیروی کرو تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اس طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا اس صورت میں بھی جب کہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے رہے ہوں اور نہ راہِ ہدایت پر رہے ہوں؟

(البقرۃ - ۲ : ۱۷۰)

اس سے معلوم ہوا کہ کسی طریقہ کے اچھے ہونے کی مجرد یہ دلیل کافی نہیں ہے کہ وہ باپ دادا کا طریقہ ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ باپ دادا نے اس طریقہ کو اندھی تقلید کی بنا پر اختیار کیا ہے یا سمجھ بوجھ کر۔ اگر یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ باپ دادا بڑے لکیر کے فقیر رہے ہیں اس نے ان کی پیروی کی تو اس کی مثال اس اندھے کی ہوگی جس نے دوسرے اندھے کو اپنا عصا کش یا رہنما بنا لیا۔

باپ دادا کے طریقہ کے سند ہونے کی دوسری شکل یہ ہے کہ اطمینان بخش دلائل سے یہ علم ہو کہ ہمارے اسلاف میں فلاں گروہ ہدایت یافتہ گروہ رہا ہے۔ مثلاً ہم پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ جانتے اور مانتے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے اصحاب (رضی اللہ عنہم) اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی سیدھی راہ پر تھے۔ اپنے اس اطمینان کی بنا پر ہم ان کے طریقہ کو سند مانتے ہیں اور بسا اوقات ان لوگوں کے طریقہ کو سند نہیں مانتے جو ان کے بعد ہوئے اگرچہ باپ دادا ہونے کے اعتبار سے وہ پہلوں کے مقابل میں ہم سے قریب تر ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ مجرد باپ دادا کا طریقہ ہونا کسی بات کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہے، بلکہ حق ہونے کے دلائل اس سے الگ ہیں۔ حق کے طالب کو نگاہ ان پر جمانی پڑتی ہے۔

زندگی پر معاشرہ کے ان گہرے اور دیرپا اثرات کے سبب سے ہر عاقل و بالغ پر اس سے متعلق چند نہایت اہم ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جن کا تقاضا انسان کی عقل بھی کرتی ہے اور ان کا حکم شریعت نے بھی دیا ہے۔ ہم یہاں بالاجمال ایک مناسب ترتیب سے ان کا ذکر کریں گے۔

مرحلۂ دعوت :

پہلی ذمہ داری ہر ذی ہوش پر یہ ہے کہ وہ معاشرہ کے بناؤ اور بگاڑ سے بے تعلق نہ رہے، بلکہ جو خرابی بھی اس کے اندر سر اٹھاتی نظر آئے، اپنے امکان اور صلاحیت کے حد تک، اس کو روکنے کی کوشش کرے۔ اگر یہ خیال کر کے کہ پرائے جھگڑے میں پڑ کر اپنے لیے کیوں مصیبت خرید یے، کوئی شخص اپنا فرض ادا کرنے سے گریز کرے گا تو وہ یاد رکھے کہ اس کی اس سہل انگاری کے نتیجہ میں جو برائی جڑ پکڑے گی ہو سکتا ہے کہ وہ پورے معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے لے اور ایک دن اس کا خمیازہ اس کو بھی اور اس کی آئندہ نسلوں کو بھی بھگتنا پڑے۔ آج تو امکان ہے کہ معمولی کوشش سے معمولی مخالفت کا مقابلہ کر کے اس فتنہ کو دبایا جا سکے، لیکن کل کو شاید سر دے کر بھی اس کو دبانا ممکن نہ رہے۔

یہ حقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کشتی کے مسافروں کی تمثیل سے سمجھائی ہے کہ جس طرح ایک کشتی میں کچھ لوگ اس کے اوپر کے حصہ میں سفر کرتے ہیں اور کچھ اس کے نیچے کے حصہ میں، لیکن کشتی کی سلامتی کی فکر دونوں کو کرنی پڑتی ہے۔ نہ اوپر والے نیچے والوں کے کسی غلط اقدام سے بے پروا رہ سکتے، نہ نیچے والے اوپر والوں کے کسی نقصان رساں فعل سے اغماض برت سکتے۔ اگر ایسا کریں تو دونوں تباہ ہو سکتے ہیں۔ فرض کیجیے نیچے والے یہ سوچ کر کہ ان کو پانی لینے کے لیے بار بار اوپر جانے کی زحمت اٹھانی پڑتی ہے تو کیوں نہ وہ کشتی کے پیندے میں سوراخ کر کے اپنے لیے پانی کا انتظام کر لیں اور اوپر والے یہ خیال کر کے کہ وہ اپنے حصہ میں سوراخ کر رہے ہیں تو پرائے فتنہ میں کیوں مداخلت کریں، ان کو جو کچھ وہ چاہتے ہیں کرنے کے لیے چھوڑ دیں تو جب اس عمل کے نتیجہ میں کشتی ڈوبے گی تو اوپر اور نیچے، دونوں حصوں کے مسافروں کے ساتھ ڈوبے گی۔

یہی حال ایک معاشرہ کے افراد کا ہے۔ اگر اس کے کچھ افراد کسی برائی کی نیو ڈالیں اور دوسرے جو ان کو سمجھانے یا روکنے کی پوزیشن میں ہیں ان کے ہاتھ نہ پکڑیں، اس کو پرایا جھگڑا سمجھ کر یا کسی خوف اور مصلحت کے سبب سے، اس سے بے تعلق رہیں، تو ہو سکتا ہے کہ اس سے جو شر پیدا ہو ایک دن وہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے اور پھر اس کے آخری نتیجہ کے طور پر اگر خدا کا کوئی قہر نازل ہو تو وہ سب کو فنا کر دے۔

یہ ذمہ بحیثیت ایک ذمہ داری کے تو معاشرہ کے تمام افراد پر عائد ہوتی ہے، لیکن اس کے ادا کرنے میں چونکہ صلاحیت بھی درکار ہے اس وجہ سے جتنی جس کے اندر صلاحیت ہوگی اسی

مقدار سے اس کی ذمہ داری ہوگی۔ اگر ایک شخص بُرائی کو روک دینے کا اختیار رکھنے والا ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس کے روکنے کے لیے اپنا اختیار استعمال کرے۔ اگر ایک شخص اختیار یا اثر تو نہیں رکھتا، لیکن زبان یا قلم سے اس کے خلاف آواز اٹھا سکتا ہے تو وہ اس کے خلاف زبان اور قلم سے جہاد کرے۔ اگر کوئی شخص یہ صلاحیت بھی نہیں رکھتا تو ادنیٰ درجہ میں اس کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس کو اپنے دل میں بُرا سمجھے اور اپنے آپ کو اس کے ہر شائبہ سے دور رکھے۔ اس آخری درجہ سے متعلق انکارِ منکر والی حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہ ہیں کہ ولیس وراء ذلک من الایمان حبۃ خردل[1] (اس سے پیچھے ایمان کا کوئی درجہ رائی کے دانہ کے برابر بھی نہیں ہے)۔

یہ معاشرہ کے ہر فرد پر معاشرہ کا ایک حق ہے جس کو ادا کرنا واجب ہے۔ یہ کوئی احسان نہیں ہے کہ جی چاہا کیا، جی نہ چاہا تو ٹال دیا۔ جس طرح ہر فرد پر اس کے ماں باپ اور بیوی بچوں کے حقوق ہیں جن کو ادا کرنے کی کوشش کرنا اس پر لازم ہے اسی طرح معاشرہ کے بھی ہر شخص پر اس کی صلاحیت کے مطابق حقوق ہیں جن کو ادا کیے بغیر کوئی شخص خلق اور خالق کے آگے سرخرو نہیں ہو سکتا۔ نیز یہ حقیقت بھی یاد رکھیے کہ یہ جو حقوق معاشرہ کے ہیں وہ معاشرہ ہی کو ادا کرنے سے ادا ہوں گے دوسروں کو ادا کرنے سے ادا نہ ہوں گے۔ اگر دعوتِ دین کا علم اٹھا کے آپ امریکہ اور افریقہ کے سفر کے لیے تو روز پابہ رکاب رہتے ہیں، لیکن وہ گمراہی جو آپ کی اپنی قوم کے گھر گھر میں پھیلی ہوئی ہے آپ کو نظر نہیں آتی یا اتنی سنگین نظر نہیں آتی جتنی امریکہ کی نظر آتی ہے تو آپ کی یہ حق تلفی آپ کی اس نیکی کی وجہ سے جو آپ باہر کرتے ہیں کچھ ہلکی نہیں ہو جائے گی۔ بلکہ آپ کی مثال اس شخص کی ہوگی جو اپنے بیرونی دوستوں کو آئے دن ہوٹلوں میں ڈنر پر بلانے اور ان کے ڈنر میں جانے کے لیے تو بڑا فیاض ہے، لیکن اس کے اپنے بیوی بچے گھر میں بھوکے ہوتے ہیں۔ سیدنا مسیح علیہ السلام نے بھی فرمایا ہے کہ "میرے پاس جو روٹی ہے۔ وہ بچوں ہی کے لیے ہے، اس کو کتوں کے آگے ڈالنا ٹھیک نہیں ہے"۔

پس داعیانِ دین پر یہ حقیقت واضح ہونی چاہیے کہ یہ کوئی تجارت نہیں ہے کہ اس کے لیے میدان دنیوی نفع و نقصان کو پیشِ نظر رکھ کر تلاش کیا جائے بلکہ یہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، اپنے معاشرہ سے متعلق ایک فرض ہے جو ہر اس شخص پر عائد ہوتا ہے جو معاشرہ کی کسی خدمت کی صلاحیت

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب کون النہی عن المنکر من الایمان۔

رکھتا ہے۔ اس فرض کو اپنے ہی معاشرہ کے اندر ادا کرنا ہے، خواہ اس کی زمین کتنی ہی بنجر ہو۔ یہ آپ کے اوپر معاشرہ کا ایک قرض ہے جو اس کو ادا کر کے آپ اس سے سبک دوش ہو سکتے ہیں۔ اس باب میں حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی سنت تو یہ ہے کہ انہوں نے اسی معاشرہ کو اپنی تمام دعوتی سرگرمیوں کا میدان بنایا جس کے اندر سے وہ اٹھے اور اس وقت تک اس میدان میں ڈٹے رہے جب تک ان کو وہاں سے ہٹنے کی اجازت نہ ملی۔ کسی نبی کے متعلق بھی یہ بات علم میں نہیں آئی ہے کہ اس نے اپنا معاشرہ چھوڑ کر دعوت کے لیے دوسرے جزیروں کی تلاش میں خشکی اور تری کا سفر کیا ہو۔ انہوں نے اپنے معاشرہ سے باہر قدم اس وقت نکالا جب اللہ تعالیٰ نے ان کو ہجرت کا حکم دیا ہے اور یہ حکم ان کو اس وقت دیا گیا ہے جب یہ معلوم ہو گیا ہے کہ اس معاشرہ کے اندر زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہی ہے۔

معاشرہ کی یہ خدمت چونکہ اس کے ایک واجب حق کی حیثیت سے کی جاتی ہے اس وجہ سے اس کا کوئی صلہ اس سے نہیں چاہا جاتا۔ چنانچہ تمام انبیاء علیہم السلام کی زبان سے یہ اعلان ہوا ہے کہ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الشعراء ۲۶: ۱۰۹) (اور میں اس پر تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا۔ میرا صلہ تو عالم کے خداوند کے ذمہ ہے)۔ اسی طرح بعض نبیوں سے یہ بھی منقول ہے کہ "تم نے مفت پایا ہے، مفت بانٹ رہے ہیں"۔ داعیانِ حق کی یہی بے غرضی اس دعوت کی اصل امتیازی صفت رہی ہے اور ایسے ہی داعیوں نے دین کی خدمت کی توفیق پائی ہے، نہ کہ گداؤں نے جو کشکولِ گدائی لیے مشرق و مغرب کے چکر لگاتے پھرتے ہیں۔

اس دعوت کے باب میں حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے صالح متبعین کا طریقہ یہ رہا ہے کہ کسی نے ان کی بات سنی یا نہیں سنی، لیکن انہوں نے اپنی دعوت اس وقت تک جاری رکھی جب تک اس کا امکان پایا۔ یہ نہیں ہوا کہ چند دن کام کرنے کے بعد اگر اندازہ ہوا کہ یہ زمین کچھ زیادہ زرخیز نہیں ہے تو وہاں سے خیمے اکھاڑ کسی اور مقام پر جا کر ڈیرے ڈال دیے۔ ان کی جدوجہد کا انحصار لوگوں کے التفات پر نہیں، بلکہ اپنے ادائے فرض پر رہا۔ انہوں نے اپنا محاذ اسی وقت بدلا ہے جب ان پر واضح ہو گیا کہ اس محاذ پر اپنے فرض سے وہ سبک دوش ہو گئے۔

قرآن مجید میں ان داعیانِ اصلاح کی سرگزشت بیان ہوئی ہے جو سبت کی بے حرمتی کرنے والوں کی اصلاح کے لیے اٹھے تھے۔ ایک مدت کی دعوت کے بعد بھی جب ان کی بات پر کسی نے کان نہیں دھرے تو ان کے بعض ساتھیوں نے اپنے دوسرے ساتھیوں سے کہا کہ جو لوگ اتنے قسی القلب ہیں کہ

کوئی بات سننے کے روادار ہی نہیں ان کے پیچھے وقت برباد کرنے سے کیا حاصل؟ یہ سوال اور اس کا جواب سورۂ اعراف میں یوں نقل ہوا ہے:

وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا ۙ اللَّهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۖ قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ○

(الاعراف - ۷ : ۱۶۴)

اور یاد کرو جب کہ ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کیے جاتے ہو جنہیں یا تو اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا انہیں ایک سخت عذاب دینے والا ہے۔ وہ بولے کہ یہ اس لیے کہ یہ تمہارے رب کے سامنے ہماری طرف سے عذر بن سکے اور تاکہ یہ خدا کے غضب سے بچیں۔

ان کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں اپنا مشن اصلاً تو اس لیے جاری رکھنا ہے کہ ہمارا عذر عنداللہ واضح ہو جائے کہ ہم نے معاشرہ کی اصلاح سے متعلق اپنی ذمہ داری ادا کر دی، قطع نظر اس سے کہ لوگوں نے ہماری بات سنی یا اپنے کان بند رکھے۔ علاوہ ازیں امکان اس کا بھی ہے کہ شاید کسی مرحلہ میں یہ کان کھولیں اور توبہ و اصلاح کر کے اپنے کو اللہ کے عذاب سے بچانے کی فکر کریں۔ ہم غیب نہیں جانتے اس وجہ سے ہمارے لیے یہی بہتر ہے کہ ہم اپنے کام میں لگے رہیں اور لوگوں کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑیں۔

رہا یہ سوال کہ معاشرہ کے مصلحین کے لیے کب یہ جائز ہوتا ہے کہ وہ اس سے اعلانِ براءت کر کے علیحدہ ہوں تو اس کا جواب قرآن حکیم کی روشنی میں یہ ہے کہ جہاں تک رسولوں کا تعلق ہے ان کے لیے براءت کے اعلان کا وقت خود اللہ تعالیٰ مقرر کرتا ہے۔ وہ اللہ ہی کی طرف سے ایک محاذ پر مامور کیے جاتے ہیں اس وجہ سے ان کے لیے اس وقت تک ہٹنا جائز نہیں ہے جب تک وہی ان کو اجازت نہ دے۔ قرآن مجید میں حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق ہوا ہے کہ ایک مدت تک وہ اپنی قوم کو دعوت دیتے رہے، لیکن کسی نے ان کی بات نہ سُنی۔ بالآخر وہ قوم کو چھوڑ کر چلے گئے کہ جو لوگ اتنے ناقدرے ہیں کہ حق بات ان کو سننی ہی گوارا نہیں ان کے آگے حق کو پیش کر کے اس کی ناقدری کرانے سے کیا حاصل! اگرچہ حضرت یونس علیہ السلام کا یہ اقدام غیرتِ حق کے جوش میں تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو پسند نہیں فرمایا، بلکہ اس کے نتیجہ میں ان کو ایک سخت ابتلاء سے سابقہ پیش آیا جس سے ان کو بڑے توبہ و استغفار کے بعد رہائی ملی۔ پھر اس رہائی کے بعد حکم ہوا کہ وہ اپنی قوم میں واپس جا کر دعوت کے کام کو ازسرِنو شروع کریں جس کو چھوڑ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ چنانچہ وہ قوم میں واپس گئے اور اُن کی اس

دوبارہ دعوت سے اللہ تعالیٰ کی یہ شان ظاہر ہوئی کہ ان کی پوری قوم ملک کے بادشاہ سمیت ایمان سے مشرف ہو گئی۔

رسولوں کے سوا دوسرے لوگ جو رسولوں کے طریقہ پر کام کرتے ہیں ان کے لیے قرآن نے اصحاب کہف کے واقعہ میں یہ رہنمائی دی ہے کہ ان کو اس وقت تک اپنی قوم کے اندر اپنے مشن میں لگے رہنا چاہیے جب تک وہ اس کو جاری رکھنے کا امکان پائیں۔ جب وہ یہ دیکھیں کہ دشمنوں نے ان کے لیے تمام راستے بند کر دیے ہیں اور اب اگر ایک قدم بھی ان کی مرضی کے خلاف اٹھایا گیا تو اندیشہ ہے کہ ان کی زندگی اور ان کی دعوت، دونوں آخری خطرے سے دوچار ہو جائیں تب ان کے لیے جائز ہوتا ہے کہ جدھر بھی ان کو کوئی راہ نظر آئے اُدھر کے لیے، اللہ کے بھروسہ پر، اُٹھ کھڑے ہوں۔ یہاں تک کہ اگر کسی غار میں پناہ لینی پڑ جائے تو یہ بھی کر سکتے ہیں۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میں بھی ان کے لیے روشنی اور اسباب زندگی مہیا کرے گا۔ یہ بات یاد رکھیے کہ قرآن مجید میں یہ تصریح موجود ہے کہ اصحاب کہف نے غار میں پناہ اس وقت لی ہے جب ان کی قوم نے ان کو یہ آخری دھمکی دے دی ہے کہ اب یا تو اپنے باپ دادا کے دین پر واپس آ جاؤ ورنہ ہم تمہیں سنگسار کر دیں گے۔

مرحلۂ ہجرت:

اس زمانے میں جو لوگ دعوتِ دین کے دعوے کے ساتھ اٹھتے ہیں وہ پیدا ہوتے ہی لوگوں سے ہجرت اور جہاد کی بیعت لینی شروع کر دیتے ہیں۔ غلبۂ اسلام کا موضوع ایک عوام پسند موضوع ہے اس وجہ سے وہ پہلا ہی قدم آخری منزل کے لیے اٹھاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ لوگ غلبۂ اسلام کے لیے انتظار کرتے کرتے تھک گئے ہیں، اب ان کو مزید انتظار کی زحمت نہیں دینی چاہیے۔ ان بے خبر جلد بازوں کو کون بتائے کہ ان کی جلد بازی کی وجہ سے راہ کے عقبات اور مراحل طے نہیں ہو جائیں گے۔ ہو گا یہ کہ یہ اپنی بے عملی اور حماقت کی وجہ سے ان ناکامیوں کی فہرست میں ایک اور عبرت انگیز اضافہ کریں گے جو پہلے ہی سے کافی طویل ہے۔

ہجرت سے متعلق پہلی بات تو یہ یاد رکھیے کہ یہ ہر دعوت کے لوازم و واجبات میں سے نہیں ہے کہ پہلے ہی دن سے اس کے لیے بیعت لینا ضروری ہو۔ اوّل تو جیسا کہ ہم نے اوپر واضح کیا، اس کا مرحلہ اس وقت آتا ہے جب داعی اپنے فرضِ دعوت سے سبک دوش ہو چکا ہو۔ دوسرے یہ کہ ہر داعی کے لیے اس مرحلہ کا پیش آنا ضروری نہیں ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام میں سے جو صرف نبی تھے،

رسول نہیں تھے، ان میں سے کسی کے متعلق بھی معلوم نہیں ہے کہ ان کو یہ مرحلہ پیش آیا ہو۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض کو مقدس کے عین منبر و محراب کے درمیان قتل کردیا گیا، لیکن یہ جانتے ہوئے کہ ان کی جان خطرے میں ہے انھوں نے ہجرت نہیں کی۔ البتہ رسولوں کو یہ مرحلہ پیش آیا ہے۔ لیکن ان میں سے بھی ہر ایک کے متعلق دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ ان کو اس مرحلے سے گزرنا پڑا ہو۔ بلکہ اس کے برعکس سیدنا یونسؑ کے واقعے جو اوپر ہم نے بیان کیا ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہجرت کو ناپسند فرمایا۔ یہاں تک کہ ایک عظیم ابتلاء سے گزرنے کے بعد ان کو دعوت کے لیے قوم میں واپس آنا پڑا اور اس دعوت سے ان کی پوری قوم مسلمان ہوگئی۔ قرآن نے اس واقعہ کو رسولوں کی تاریخ کے ایک اہم واقعہ کی حیثیت سے ذکر کیا ہے۔

دوسری یہ بات یاد رکھیے کہ ہر نقلِ مکانی ہجرت نہیں ہے۔ ہجرت صرف وہی ہے جب کوئی شخص دعوت کے مرحلے سے گزرنے کے بعد اپنے دین و ایمان کے بچانے کے لیے اپنا گھر در اور اپنی قوم کو چھوڑ کر کسی ایسی سرزمین کی طرف ہجرت کرے جہاں اس کو توقع ہو کر وہ اپنے مشن کے ساتھ زندگی بسر کر سکے گا۔ ایک مہاجر اور ایک پناہ گزین میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ پناہ گزین کا معاملہ آسان ہے۔ وہ صرف اپنی جان اور ناموس کا تحفظ چاہتا ہے اس وجہ سے اس کو پناہ دینے والوں پر کوئی بڑی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس ایک مہاجر جہاں بھی بیٹھتا ہے اپنے مشن کے ساتھ بیٹھتا ہے اس وجہ سے جو اس کی پذیرائی کا شرف حاصل کرتے ہیں ان کو بالواسطہ اس کے مشن کا بھی خیر مقدم کرنا پڑتا ہے اور یہ جانتے ہوئے کرنا پڑتا ہے کہ یہ کسی مرحلہ میں بھی اپنے مشن کے باب میں کسی سمجھوتہ پر راضی ہونے والا نہیں ہے۔ اگر یہ کسی مداہنت پر راضی ہونے والا ہوتا تو اپنا گھر در کیوں چھوڑتا، پھر تو کچھ نرم گرم معاملہ کر کے وہیں گزر بسر کرتا۔ لیکن جب مشن ہی کے لیے اس نے سب کو چھوڑا ہے تو اس کی خاطر تو وہ سب کچھ چھوڑ سکتا ہے، لیکن مشن سے دست بردار ہونے کی توقع تو اس سے نہیں کی جاسکتی۔ اس کو مختصر لفظوں میں یوں سمجھیے کہ مہاجر کی ہجرت اپنے رب کی طرف ہوتی ہے، جیسا کہ سیدنا ابراہیمؑ کا ارشاد ہے، 'اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ' (العنکبوت-۲۹: ۲۶) (میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں)۔ اس وجہ سے اس کو صرف اسی کی پروا ہوتی ہے۔ لوگوں کی طرف اس کی ہجرت نہیں ہوتی کہ وہ ان کے رویہ کو کچھ زیادہ اہمیت دے۔

مرحلۂ جہاد :

دعوت اور ہجرت کے مراحل سے گزرنے کے بعد جہاد اور جنگ کا مرحلہ آتا ہے۔ اس وقت ایک طرف تو قوم پر حجت تمام ہو جاتی ہے، اس کے اندر جتنا مکھن ہوتا ہے وہ الگ ہو چکا ہوتا ہے، صرف چھاچھ رہ جاتا ہے، دوسری طرف داعی کو یہ ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو جاتا ہے کہ اب تک کی جدوجہد سے دعوت کی راہ میں جان کی بازی کھیلنے والی کتنی سعید روحیں اس کے اردگرد اکٹھی ہوئی ہیں، ان کے اوپر کس حد تک بھروسہ کیا جاسکتا ہے اور ان کی مجموعی طاقت کے بل پر آگے کیا قدم اٹھایا جاسکتا ہے۔ ایک داعی جب تک صرف وعظ کرتا ہے اس وقت تک تو اس کو صرف زبان کی قوت، کسی مسجد کا منبر اور سامعین کی ایک منتشر بھیڑ کافی ہے، لیکن اگر وہ جہاد کے لیے اٹھنے کا حوصلہ کرتا ہے تو چند اور چیزیں بھی درکار ہیں: ایک آزاد علاقہ جس میں وہ بااختیار ہو، اور ایک آزاد اور منظم جماعت جس پر اس کا اقتدار حاکمانہ ہو اور جس کو وہ اس قسم کی فوجی ٹریننگ دینے کا اہتمام کر سکتا ہو جو اس زمانے میں کارآمد ہو سکے۔ جہاد سے مراد وہ بڑبونگ نہیں جس کا منصوبہ آج بعض جہادی پمفلٹوں میں پیش کیا جاتا ہے کہ سمع و طاعت کے پابند مریدوں کو حکم دیا جائے گا اور وہ بیلچوں اور لٹھوں سے مسلح ہو کر کسی بنک یا سینما یا ہوٹل پر چڑھ دوڑیں گے۔ ان طالع آزماؤں کو اس طرح کے جہاد کا موقع شاید ایک آدھ بار مل جائے لیکن اس کے نتائج اُن طفلانہ حرکتوں کے نتائج سے مختلف نہیں ہو سکتے جو ماضی قریب میں کی گئیں اور آج بھی درس آموزی کے لیے کافی ہیں۔ ہم یہاں اپنی ایک تحریر کا اقتباس[1]، شرائطِ جہاد سے متعلق پیش کرتے ہیں تاکہ جو لوگ جہاد کو بچوں کا کھیل سمجھے ہوئے ہیں وہ چاہیں تو اپنی اصلاح کر لیں:۔

دعوتِ حق کے سلسلہ میں جنگ کی نوبت اس وقت آتی ہے جب تبلیغ اور شہادت علی الناس اور ہجرت کے مرحلے گزر چکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی جنگ کے لیے چند ضروری شرطیں ہیں۔ جب تک یہ شرطیں پوری نہ ہو لیں اہل حق کے لیے تلوار اٹھانا اور زمین میں خوں ریزی کرنا جائز نہیں ہے۔ اور اگر وہ جلدبازی سے ایسا کر بیٹھیں تو ان کا یہ فعل ایک مفسدانہ فعل ہوگا جس پر اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر و ثواب پانا تو الگ رہا الٹا اندیشہ اس بات کا ہے کہ ان سے مواخذہ ہو جائے اور وہ فساد فی الارض کے مجرم قرار پائیں۔

یہ شرطیں مندرجہ ذیل ہیں:

---

[1] دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار: باب ۱۴

۱۔ پہلی شرط یہ ہے کہ جن لوگوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا جائے ان پر پہلے پوری طرح حق کی تبلیغ کردی جائے۔ اس تبلیغ کے بغیر کسی قوم کے خلاف اعلانِ جنگ ناجائز ہے۔ اس کلیہ سے صرف وہ جنگ مستثنیٰ ہے، جو مدافعت و حفاظت میں ہو۔ دفاعی جنگ، ہر حالت میں لڑی جاسکتی ہے۔ اس کو افراد بھی لڑسکتے ہیں اور جماعتیں بھی لڑسکتی ہیں۔ یہ جنگ تبلیغ کی شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہے۔ جب بھی کسی کے جان و مال اور عزت پر کوئی حملہ ہو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی حفاظت میں جو قوت بھی اس کے پاس بروقت بہم ہو اس کو استعمال کرے۔ اس راہ میں اگر وہ مارا جائے گا تو اس کو شہادت حاصل ہوگی، اور اگر حملہ آور حریف مارا جائے گا تو اس پر دوہرا گناہ ہوگا۔ ایک اس بات کا کہ اس نے اپنی جان ایک معصیت اور حق تلفی کی راہ میں ہلاک کی، دوسرا اس بات کا کہ اس نے ایک صاحبِ حق کی تلوار خون سے آلودہ کرائی۔ باقی رہی جارحانہ جنگ تو وہ اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک مقدم الذکر شرط، تبلیغ پوری نہ ہولے۔ لیکن اس تبلیغ کی دو صورتیں ہیں اور ان دونوں صورتوں میں جنگ کے احکام کی نوعیت کچھ مختلف ہوجاتی ہے۔

(الف) ایک صورت تو یہ ہے کہ یہ تبلیغ رسول کے ذریعہ سے ہو۔ رسول تبلیغ اور اتمامِ حجت کا کامل ذریعہ ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے اتمامِ حجت کی تمام شرطیں کمال درجہ پوری ہوجاتی ہیں۔ اس عالمِ اسباب میں عقلِ انسانی کو مطمئن کرنے کے لیے جو کچھ ممکن ہے وہ بہتر سے بہتر طریق پر ایک رسول پورا کردیتا ہے اور اس غرض کے لیے اللہ تعالیٰ اس کو تمام اسباب و وسائل سے مسلح کرکے بھیجتا ہے۔ وہ قوم کے اندر کا بہترین شخص ہوتا ہے۔ اعلیٰ ترین حسب و نسب کے ساتھ اٹھتا ہے، وہ نبوت سے پہلے بھی اور نبوت کے بعد بھی پاکیزہ ترین اخلاق کا مظاہرہ کرتا ہے، جھوٹ، بہتان، مکاری، بدمعاملگی، ادعائے برتری اور خواہشِ تفوق کی آلودگیوں سے اس کا دامن بالکل پاک ہوتا ہے اور اس کی ان خوبیوں کی شہادت جس طرح اس کے دوست دیتے ہیں اسی طرح اس کے دشمنوں کو بھی اس کے ان فضائل سے انکار کی مجال نہیں ہوتی۔ وہ بہترین، عام فہم زبان میں اپنی دعوت پیش کرتا ہے اور اس دعوت کو قوم کے بچے بچے تک پہنچا دینے کے لیے اپنے رات دن ایک کردیتا ہے۔ اس کی تعلیم عقلی استدلال کے اعتبار سے اتنی محکم اور مضبوط ہوتی ہے کہ مخالفوں سے اس کا جواب بن نہیں آتا، اس کے فیض تعلیم و صحبت سے لوگوں کی زندگیاں یکسر بدل جاتی ہیں۔ ظالم اور مفسد، حق شناس اور عدل پسند ہوجاتے ہیں، ڈاکو اور راہزن، نیکوکار اور امن پسند بن جاتے ہیں، زانی اور بدمعاش، عفیف اور پاک دامن بن جاتے ہیں، شرابی اور جواری پاکیزہ اخلاق اور خدا ترس ہوجاتے ہیں ——— وہ جو کچھ کہتا ہے پہلے اس کو خود کرکے دکھاتا ہے، اور جس قانون و نظام کا داعی ہوتا ہے اس کا سب سے زیادہ پابند و مطیع وہ خود ہوتا ہے۔ وہ اپنی دعوت کی حقیقت کا اپنے ساتھیوں کی زندگی میں بھی مظاہرہ کراتا ہے۔ وہ لوگوں کے مطالبہ پر معجزے بھی دکھاتا ہے۔ ان تمام وجوہ سے ایک رسول کی تبلیغ

اتمامِ حجت کا آخری ذریعہ ہے اور جب کسی قوم پر رسول کے ذریعہ سے اتمامِ حجت ہوچکتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بعد کسی قوم کے منکرینِ حق کو جینے کی مہلت نہیں دیا کرتا بلکہ لازمی طور پر دو باتوں میں سے کوئی نہ کوئی بات ہوکے رہتی ہے۔ اگر حق کو قبول کرنے والے تعداد میں تھوڑے ہوتے ہیں اور قوم کا بڑا حصہ منکر و مخالف رہ جاتا ہے تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو الگ کرلیتا ہے اور منکرین و مخالفین کو کوئی ارضی و سماوی عذاب بھیج کر فنا کردیتا ہے جیسا حضرت نوح، حضرت صالح، حضرت شعیب علیہم السلام وغیرہ کی قوموں کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا اور اگر منکرین کی طرح مومنین کی تعداد بھی معتد بہ اور معقول ہوتی ہے تو اس صورت میں اہلِ ایمان کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ منکرین کے خلاف اعلانِ جنگ کریں اور یہ جنگ اس وقت تک جاری رکھیں جب تک یہ منکرین توبہ کرکے خدا کے دین کو قبول نہ کریں، یا ان کی نجاست سے خدا کی زمین پاک نہ ہوجائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اتمامِ حجت کے بعد بنی اسمٰعیل کے خلاف اسی قسم کی جنگ کے اعلان کا حکم دیا گیا۔

یہ قانون جس اصل پر مبنی ہے وہ یہ ہے کہ خدا کے رسول اس کے قانونِ مکافات کے مظہر ہوتے ہیں وہ زمین میں خدا کی عدالت بن کر آتے ہیں اور ان کی بعثت کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ حق و باطل میں فیصلہ ہوجائے، اہلِ حق کامیاب و فائز المرام ہوں اور اہلِ باطل ناکام و نامراد ہوں۔ چونکہ اس طرح جزا و سزا کے لیے ضروری ہے کہ سزا پانے والوں پر خدا کی حجت پوری طرح تمام کردی جائے۔ اس وجہ سے رسول اتمامِ حجت کے تمام شرائط کے ساتھ بھیجے جاتے ہیں۔ یہ شرطیں جب پوری ہوجاتی ہیں تو خدا کا قانون ان لوگوں کو جینے کی مہلت نہیں دیتا جو نری ہٹ دھرمی کی وجہ سے حق کا انکار کرتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سزا چونکہ اس اتمامِ حجت کے بعد دی جاتی ہے جس کے بعد اس دنیا میں اتمامِ حجت کا کوئی اور درجہ باقی نہیں رہ جاتا اس وجہ سے اس کو جبر و اکراہ نہیں قرار دیا جاسکتا، بلکہ یہ عدل و انصاف کا عین مقتضیٰ ہے۔ رسولوں کے ذریعہ سے اتمامِ حجت ہوچکنے کے بعد بھی جو لوگ اللہ کے دین کو قبول نہیں کرتے ان کے لیے اگر کوئی اور چیز باقی رہ جاتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ غیب کے پردے اٹھا دیے جائیں اور ان کو تمام حقائق کا آنکھوں سے مشاہدہ کرا دیا جائے، لیکن اس طرح کا کشفِ حجاب اللہ تعالیٰ کی اس سنت کے خلاف ہے جو اس دنیا میں جاری ہے۔ اس دنیا میں ہم سے ایمان و اسلام کا مطالبہ عقل و استدلال کی بنا پر کیا گیا ہے، نہ کہ مشاہدہ اور معاینہ کی بنا پر۔ اس وجہ سے عقل و استدلال کے لیے جو کچھ مطلوب ہے، جب رسولوں کے واسطہ سے وہ مل چکتا ہے تو اس کے بعد مہلت ملنے کے کوئی معنی نہیں اور اس کے بعد سزا دینے میں جبر کا بھی کوئی پہلو نہیں ہے۔

(ب) دوسری صورت یہ ہے کہ یہ تبلیغ صالحین کے ذریعہ سے ہو۔ صالحین کے ذریعہ سے اس درجہ کا اتمامِ حجت ممکن نہیں ہے جس درجہ کا اتمامِ حجت رسولوں کے ذریعہ سے ممکن ہے۔ نہ یہ ان اسباب و وسائل ہی

سے پوری طرح بہرہ مند ہوتے جو رسولوں کے پاس ہوتے ہیں، اور نہ ان کی ذہنی اور قلبی حالتیں ہی وہ ہو سکتی ہیں جو اللہ کے رسولوں کی خصوصیات میں سے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کا شبہات اور بدگمانیوں سے اس درجہ بالاتر ہونا بھی ناممکن ہے جس طرح اللہ کے یہ معصوم رسول ان چیزوں سے بالاتر ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ منکرینِ حق کے خلاف جو جنگ کرتے ہیں اس کی غایت صرف عدل اور امن کا قیام ہے۔ ان کو صرف یہ حق حاصل ہے کہ جو لوگ خدا کے دین کو قبول نہ کریں ان سے جنگ کر کے ان کے ہاتھوں سے اس سیاسی طاقت کو چھین لیں جو ان کی بیماریوں کو دوسرے بندگانِ خدا تک متعدی کر سکتی ہے اور جتنے سے ان کا یہ مقصد پورا ہو جائے اسی حد پر ان کو رک جانا چاہیے۔ اس حد سے آگے بڑھنے کی ان کو اجازت نہیں ہے۔ اگر اس حدِ متعین سے ایک قدم بھی وہ تجاوز کر جائیں تو اس پر خدا کے ہاں وہ بازپرس کے مستحق ہوں گے۔ اسی طرح کی جنگیں ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہؓ کے زمانوں میں ہوئیں۔ صحابہؓ اپنی مخالف قوموں کے سامنے تین متبادل چیزیں پیش کیا کرتے تھے: ایک یہ کہ اسلام لاؤ اور اسلام لا کر ہر چیز میں ہمارے برابر کے شریک و سہیم بن جاؤ۔ دوسری یہ کہ اسلامی حکومت کی رعایا بن جاؤ اور ایک متعین ٹیکس ادا کر کے اپنے پرسنل لا کے سوا تمام امور میں ہمارے نظم کی اطاعت کرو۔ تیسری یہ کہ ہمارے اعلانِ جنگ کو قبول کرو۔ اس صورت میں اگرچہ یہ گمان ہوتا ہے کہ صحابہؓ کی یہ تبلیغ نہایت اجمالی تھی اور وہ اس تفصیل و وضاحت کے ساتھ دینِ حق کو لوگوں کے سامنے پیش نہیں کرتے تھے جس تفصیل و وضاحت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا یا جس تفصیل و وضاحت کے ساتھ اس کو اچھی طرح دل نشین کرنے کے لیے پیش کرنا ضروری ہے، لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ صحابہؓ کے زمانہ میں ایک نظامِ حق عملاً قائم ہو چکا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ دعوت میں موجود نہیں تھا۔ اس وجہ سے صحابہؓ اسلام کی تفہیم کے لیے کسی تفصیلی تبلیغ سے مستغنی تھے۔ ان کا قائم شدہ نظامِ حق خود اس حقیقت کے اظہار کے لیے کافی تھا کہ اسلام کیا ہے اور وہ بندۂ خدا سے ان کی انفرادی و اجتماعی زندگیوں میں کن باتوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس عملی نظام کی وجہ سے ہر حقیقت ان کے زمانہ میں نمایاں اور ہر بات واضح تھی۔ عقیدہ ہو یا عمل، معاشرت ہو یا سیاست، ہر چیز ایک مکمل حیاتِ اجتماعی کے پیکر میں دنیا کی نگاہوں کے سامنے موجود تھی اور ہر شخص اس کو آنکھوں سے دیکھ کر یہ معلوم کر سکتا تھا کہ اسلام کا ظاہر و باطن کیا ہے اور وہ کن اعتبارات سے دنیا کے تمام نظاموں پر فوقیت رکھتا ہے اور کیوں اسی کو حق حاصل ہے کہ وہ باقی رہے اور اس کے سوا دنیا کے سارے نظام مٹ جائیں۔ اس طرح کا نظام جب بھی دنیا میں قائم و موجود ہو تو وہ اہلِ حق کو تفصیلی دعوت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دے گا اور مجرد اس کے قیام کی وجہ سے اہلِ حق کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ لوگوں سے اس کی اطاعت کا مطالبہ کریں اور اگر لوگ اس مطالبہ سے انکار

کریں تو وہ ان سے جنگ کر کے اس مطالبہ کو تسلیم کرنے پر مجبور کریں۔ اسلام، عدمِ اتمامِ حجت کی صورت میں، جو غیر رسل کی دعوت میں متصور ہے، لوگوں کے اس انفرادی حق کو تو تسلیم کرتا ہے کہ وہ جس عقیدہ پر چاہیں قائم رہیں، لیکن وہ کسی گروہ کے لیے یہ حق تسلیم نہیں کرتا کہ وہ کسی غیر عادلانہ نظامِ حیات کو لوگوں پر بجبر مسلط کرے۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ یہ جنگ صالحین کے ذریعہ سے لڑی جائے۔ کیونکہ اسلامی جہاد دنیا کو فساد سے پاک کرنے کے لیے ہے، اس وجہ سے ان لوگوں کا جہاد کے لیے اٹھنا کوئی معنی نہیں رکھتا جو خود فساد سے آلودہ ہوں۔ یہ کام صرف انہی لوگوں کے کرنے کا ہے اور وہی لوگ اس کو کر سکتے ہیں جو سو فی صد اس مقصد پر ایمان رکھتے ہوں جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے جہاد کا حکم دیا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے یہ بات جائز ہے کہ وہ تلوار اٹھائیں اور ان ہی لوگوں کی جنگ جہاد فی سبیل اللہ کے الفاظ سے تعبیر کی گئی ہے۔ یہ لوگ اگر اس راہ میں مارے جائیں تو شہید ہوتے ہیں، اور اگر زندہ رہتے ہیں تو غازی اور مجاہد فی سبیل اللہ کے لقب کے مستحق ہیں۔ جو لوگ اس حق و عدل پر ایمان نہ رکھتے ہوں، جس کے قیام کے لیے جہاد کا حکم دیا گیا ہے، ان کو اسلام ہرگز یہ حق نہیں دیتا کہ وہ کسی ایک متنفس کا بھی خون بہائیں اور اگر وہ بہائیں گے تو ان کا یہ فعل ایک مفسدانہ فعل ہو گا اور اس پر ان سے مواخذہ ہو گا۔ اسلامی فوج کرایہ کے آدمیوں سے نہیں بنتی، بلکہ وہ ایسے لوگوں سے مرتب ہوتی ہے جو اسلام پر اعتقاد رکھتے ہیں اور اسی کی خاطر لڑتے مرتے ہیں۔ اسلامی نظام کی یہ عین فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ صرف اپنے معتقدین ہی کے ذریعہ سے برپا ہو اور وہی لوگ اس کے برپا کرنے میں ساعی ہوں جو یہ سعی محض رضائے الٰہی کے حصول اور اقامتِ حق کی خاطر کریں، نہ کہ کسی دنیوی مفاد کی خاطر۔ اگر ان کی سعی میں حصولِ رضائے الٰہی اور اقامتِ حق کے پاک جذبہ کے سوا کوئی اور جذبہ شامل ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ ان کی اس سعی کی اسلام کی نظر میں کوئی قیمت نہیں ہے، بلکہ جو خون بھی اس سلسلہ میں انہوں نے بہایا ہے اس کا وبال ان کی گردن پر ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ رسولوں نے جہاد کے اعلان سے پہلے اس غرض کے لیے صالحین کی جماعت بنائی، کرایہ کے آدمیوں کی کوئی فوج نہیں مرتب کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کے سلسلہ میں بعض ایسے مواقع بھی پیش آئے کہ ایسے لوگوں نے مسلمانوں کی حمایت میں لڑنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں جو اسلام پر عقیدہ نہیں رکھتے تھے اور محض قومی عصبیت کے تحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امداد کرنا چاہتے تھے۔ آپ نے ان کی پیشکش قبول نہیں فرمائی اور صاف فرما دیا کہ میں اس کام میں ان لوگوں کی مدد سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا جو اس مقصد پر ایمان نہ رکھتے ہوں جس مقصد کے لیے یہ لڑائی لڑی جا رہی ہے۔ حضرت موسیٰ، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام نے جو غزوات کیے وہ تمام تر مومنین صالحین کے ذریعہ سے کیے۔

یہی بات صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی ثابت ہے کہ ان کے زمانوں میں جتنے بھی غزوات ہوئے، سب

انہی لوگوں کے ذریعہ ہوئے جو اعتقاداً اور عملاً اس چیز کو تسلیم کرتے تھے جس کو برپا کرنے کے لیے انہوں نے تلوار اٹھائی تھی اور باوجودیکہ ان کے اثرات بہت وسیع تھے اور وہ چاہتے تو آسانی سے کرایہ کی فوج جمع کر لیتے، لیکن نہ صرف یہ کہ انہوں نے کرایہ کی کوئی فوج نہیں بھرتی کی، بلکہ خود اپنی بھی کوئی تنخواہ دار مستقل فوج نہیں قائم کی۔ جب جنگ کی حالت پیش آجاتی تو ہر شخص اپنا توشہ اور اپنی سواری لے کر نکلتا اور محض اقامت دین کی خاطر جہاد کرتا اور احتیاط اور تقویٰ کی شان یہ تھی کہ عین اس وقت جب کہ دشمن سے رد و بدل ہو رہی ہوتی اگر کسی کے دل میں یہ خطرہ بھی گزر جاتا کہ اس وقت حصولِ رضائے الٰہی کے جذبہ کے سوا کسی اور نفسانی جذبہ سے وہ مغلوب ہو گیا ہے تو فوراً ہی اپنی کھنچی ہوئی تلوار میان میں کر لیتا کہ مبادا یہ کسی انسان کا خون محض نفس کو خوش کرنے کے لیے بہہ دے۔

(۳) تیسری شرط یہ ہے کہ یہ جنگ ایک با اختیار اور با اقتدار امیر کی قیادت و امارت میں لڑی جائے۔ با اختیار با اقتدار امیر سے مطلب یہ ہے کہ اس کا اقتدار اپنی جماعت پر بزورِ قوت قائم ہو۔ وہ لوگوں پر شریعت کے احکام نافذ کر کے اس کی اطاعت پر لوگوں کو مجبور کر سکتا ہو اور خدا کے سوا کسی اور بالاتر اقتدار کا وہ محکوم نہ ہو۔ اس شرط کا سب سے زیادہ واضح ثبوت یہ ہے کہ انبیائے کرام میں سے کسی نے بھی اس وقت تک جہاد کا اعلان نہیں کیا جب تک انہوں نے ہجرت کر کے اپنی جماعت کو کسی آزاد علاقہ میں منظم نہیں کر لیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی سے بھی اس چیز کا ثبوت ملتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے بھی اس بات کی شہادت ملتی ہے۔ بعد کے زمانوں میں بھی جن لوگوں نے انبیاء کے طریقہ پر یہ فرض انجام دینے کی کوشش کی، مثلاً حضرت سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید، انہوں نے بھی اس امر کو پیشِ نظر رکھا اور ایک آزاد علاقہ میں پہنچ کر پہلے اپنی ایک با اختیار امارت بھی قائم کی اور اپنی جماعت کی تنظیم کر کے اس کے اندر شریعت کے تمام احکام و قوانین کا نفاذ بھی کیا۔

اس شرط کی دو وجہیں ہیں:

(الف) پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی باطل نظام کے اختلال و انتشار کو بھی اس وقت تک پسند نہیں کرتا جب تک اس بات کا امکان نہ ہو کہ جو لوگ اس باطل نظام کو درہم برہم کر رہے ہیں وہ اس کی جگہ پر کوئی نظامِ حق قائم بھی کر سکیں گے۔ انارکی اور بے نظمی کی حالت ایک غیر فطری حالت ہے۔ جو انسانی فطرت سے یہ

ـہ اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا بعض حالات میں اسلامی جنگ میں حصہ لے سکتی ہے۔ لیکن اس کے شرائط و حالات بالکل خاص ہیں یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں ہے اس مسئلہ پر تفصیلی بحث ہم نے اپنی کتاب 'اسلامی ریاست' میں کی ہے۔

اس قدر بعید ہے کہ ایک غیر عادلانہ نظام بھی اس کے مقابل میں قابل ترجیح ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے کسی ایسی جماعت کو جنگ چھیڑنے کا اختیار نہیں دیا ہے جو بالکل مبہم اور مجہول ہو، جس کی قوت و استطاعت غیر معلوم اور مشتبہ ہو، جس پر کسی ایک با اختیار امیر کا اقتدار قائم نہ ہو، جس کی اطاعت و وفاداری کا امتحان نہ ہوا ہو، جس کے افراد منتشر اور پراگندہ ہوں، جو کسی نظام کو درہم برہم تو کر سکتے ہوں، لیکن اس بات کا کوئی ثبوت انہوں نے بہم نہ پہنچایا ہو کہ وہ کسی انتشار کو مجتمع بھی کر سکتے ہیں۔ یہ اعتماد صرف ایک ایسی جماعت ہی پر کیا جا سکتا ہے جس نے بالفعل ایک سیاسی جماعت کی صورت اختیار کر لی ہو اور جو اپنے دائرہ کے اندر ایک ایسا ضبط و نظم رکھتی ہو کہ اس پر "الجماعت" کا اطلاق ہو سکے۔ اس حیثیت کے حاصل ہونے سے پہلے کسی جماعت کو یہ حق تو حاصل ہے کہ وہ "الجماعت" بننے کے لیے جدو جہد کرے اور اس کی یہ جدو جہد جہاد ہی کے حکم میں ہوگی، لیکن اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ عملاً جہاد بالسیف اور قتال کے لیے اقدام شروع کر دے۔

(ب) دوسری وجہ یہ ہے کہ کسی جنگ کرنے والی جماعت کو انسانوں کے جان و مال پر جو اختیار حاصل ہو جایا کرتا ہے وہ ایسا غیر معمولی اور اہم ہے کہ کوئی ایسی جماعت اس کو سنبھال ہی نہیں سکتی جس کے لیڈر کا اقتدار اس کے اوپر محض اخلاقی قسم کا ہو۔ اخلاقی اقتدار اس امر کی کافی ضمانت نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے فساد فی الارض کو روک سکے۔ اس وجہ سے مجرد اخلاقی اقتدار کے اعتماد پر کسی اسلامی لیڈر کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے ماننے والوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت دے دے، ورنہ اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ جب ایک مرتبہ ان کی تلوار چمک جائے گی تو وہ حلال و حرام کے حدود کی پابند نہیں رہے گی اور ان کے ہاتھوں وہ سب کچھ ہو جائے گا جس کے مٹانے ہی کے لیے اس نے تلوار اٹھائی ہے۔ عام انقلابی جماعتیں، جو مجرد ایک انقلاب برپا کرنا چاہتی ہیں اور جن کا مطمحِ نظر اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ وہ قائم شدہ نظام کو درہم برہم کر کے برسرِ اقتدار پارٹی کے اقتدار کو مٹائیں اور اس کی جگہ اپنا اقتدار جمائیں، اس قسم کی بازیاں کھیلتی ہیں اور کھیل سکتی ہیں۔ ان کے نزدیک نہ کسی ظلم کا استیصال کوئی حادثہ ہے، نہ کسی ظلم کا ارتکاب کوئی معصیت، اس وجہ سے ان کے لیے سب کچھ مباح ہے۔ لیکن ایک عادل اور حق پسند جماعت کے لیڈروں کو لازماً یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ جس ظلم سے وہ خدا کے بندوں کو محروم کر رہے ہیں اس سے بہتر نظم ان کے واسطے مہیا کرنے کی وہ صلاحیت رکھتے ہیں یا نہیں اور جس ظلم کے مٹانے کے وہ در پے ہیں اس قسم کے مظالم سے اپنے آدمیوں کو روکنے پر وہ پوری طرح قادر ہیں یا نہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ محض اتفاقات کے اعتماد پر وہ لوگوں کے جان و مال کے ساتھ بازیاں کھیلیں اور جس فساد کو مٹانے کے لیے اٹھے ہیں اس سے بڑا فساد خود برپا کرا دیں۔

(۴) چوتھی شرط حصولِ قوت ہے۔ لیکن صالحین کی جماعت کو اس کے لیے کوئی علیحدہ اہتمام کرنا نہیں پڑتا۔

اوپر جو تین شرطیں بیان ہوئی ہیں ان کو ٹھیک ٹھیک پورے کر دینے سے ضروری قوت خود بخود بہم ہو جاتی ہے۔ ایک صحیح دعوت ہر قوت و استعداد کے آدمیوں کو اپنے ارد گرد مجتمع کر لیتی ہے اور ان کے واسطے سے سرمایہ بھی بہم ہو جاتا ہے اور ضروری وسائلِ کار یا ان کے پیدا کرنے کی قابلیتیں بھی فراہم ہو جاتی ہیں۔ پھر جب یہ جماعت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ایک آزاد ماحول میں اپنے آپ کو ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے ایک با اقتدار امیر کی اطاعت پر جمع کر لیتے ہیں تو ان کی اخلاقی اور معنوی قوت بھی دو چند ہو جاتی ہے اور مادی وسائل کے فراہم کرنے اور پیدا کرنے کے امکانات بھی وسیع تر ہو جاتے ہیں۔ پس جہاں تک حصولِ طاقت کی سعی کا تعلق ہے وہ فی الحقیقت ان شرائط کی تکمیل کے اندر ہی مضمر ہے۔ اس سے علیحدہ اس کے لیے کسی خاص مہم کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ تاہم جارحانہ جنگ کے لیے قوت کی فراہمی بھی ایک ضروری شرط ہے۔ اس کے بغیر کوئی جماعت جنگ کا اعلان کرے تو وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کی مجرم ہوگی۔

ان تمام شرائط کی نوعیت پر غور کرنے کے بعد یہ حقیقت آپ سے آپ واضح ہو جاتی ہے کہ کسی دعوتِ حق کے سلسلہ میں جنگ کا مرحلہ شہادت علی الناس اور ہجرت کے مراحل کے بعد کیوں آتا ہے۔ درحقیقت ان دونوں مرحلوں سے گزرنے کے بعد ہی وہ لوگ متعین ہو کر سامنے آتے ہیں جن سے اسلام میں جنگ جائز ہے اور ان مراحل سے گزر چکنے کے بعد ہی وہ جماعت بھی صحیح معنوں میں وجود میں آتی ہے جس کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ تلوار کے زور سے امن و عدل قائم کرے۔ جو لوگ انبیائے کرام کی اس ترتیبِ کار سے واقف نہیں ہیں اور صرف عام انقلابی جماعتوں کے طریقِ کار ہی سے متاثر ہیں ان کو ان تمام مراحل کے فوائد اور نتائج پر غور کرنا چاہیے۔

اطلاع

تدبر کے پچھلے شمارے جو سٹاک میں نہ تھے اب دوبارہ چھپوا لیے گئے ہیں۔ قارئین کرام جو اپنی فائل مکمل کرنا چاہتے ہیں اب مکمل سیٹ یا مطلوبہ شمارے حاصل کرنے کے لیے ادارہ سے رجوع کریں۔ (ادارہ)

تالیفاتِ امام حمید الدین فراہیؒ

	روپے پیسے
۱۔ مجموعہ تفاسیرِ فراہی :	۶۰-۰۰
۲۔ اقسام القرآن :	۵-۰۰
۳۔ ذبیح کون ہے ؟	۵-۰۰

تالیفات مولانا امین احسن اصلاحی

۱۔ تدبرِ قرآن ؛ (مکمل سیٹ : ۹ جلد) :	۷۳۰-۰۰
فی جلد :	۸۰-۰۰
۲۔ مبادئ تدبرِ قرآن :	۱۶-۰۰
۳۔ اسلامی قانون کی تدوین :	۱۲-۰۰
۴۔ اسلامی ریاست :	۳۰-۰۰
۵۔ اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل :	۱۶-۰۰
۶۔ قرآن میں پردے کے احکام :	۳-۰۰
۷۔ تنقیدات :	۱۸-۰۰
۸۔ توضیحات :	۱۲-۰۰
۹۔ تزکیۂ نفس : جلد اوّل	۲۷-۰۰
جلد دوم :	(زیرِ طبع)
۱۰۔ اصولِ تدبرِ حدیث :	(〃)
۱۱۔ دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار :	(〃)
۱۲۔ اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام :	(〃)
۱۳۔ حقیقتِ شرک و توحید :	(〃)
۱۴۔ حقیقتِ نماز :	(〃)
۱۵۔ حقیقتِ تقویٰ :	(〃)

فاران فاؤنڈیشن

۱۲۲۔ فیروز پور روڈ، اچھرہ، لاہور ۱۶ (پاکستان) فون : ۴۱۰۸۴۹